وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے خیر و برکت والی ہے

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمدؐ بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

ناشر

بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

۷۸۶

پارہ سیقول کا دوسرا جزء

ھٰذا کتابٌ انزلناہُ مبارکٌ

تفسیر ابنِ جریر اردو

تالیف

امام ابوجعفر محمد ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ قرآن پاک

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

شائع کردہ

"بیت الحکمت دیوبند"

ضلع سہارنپور یوپی

(قیمت دو روپے)

ایک نادر پیشکش

عقائد دیوبند اور اہل سنت والجماعت پر ایک معرکۃ الآرار کتاب۔

اسلامی عقیدے

تالیف :- از حضرت علامہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی رح

اردو ترجمہ:- حضرت مولانا محمد انظر شاہ صاحب کاشمیری

ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیئے؟ خدا تعالیٰ کی صفات کیا ہیں؟ وہ اگر ایک ہے تو کیوں؟ وہ عالم کا پالنہار کس لیئے ہے؟ وہ قادر کیوں ہے۔ وہ قدیر کس طرح ہے؟ اس نے اس دنیا کو کیوں پیدا کیا؟ یہ دنیا کس طرح چل رہی ہے؟ نبوت کیا ہے؟ انبیار کون ہیں؟ رسالت و نبوت کے بارہ میں اسلامی تصورات، مذہب اسلام کی حقانیت، تمام مذاہب کا مکمل بطلان، تمام غلط افکار و نظریات کی تردید۔ قیامت، صورِ اسرافیل، ملک الموت، موت اور اس کے مرحلے، عالم قبر، سوال و جواب، محشر، جنت و جہنم، پلصراط، حساب و کتاب، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، خلافتِ راشدہ، شیعہ فرقہ کی تردید اور مذہب اہل حق کی وضاحت، تقیہ کی حقیقت، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل، سیدنا ابوبکر الصدیق رض کی خلافتِ قائمہ، عمر فاروق رض کا عہدِ معدلت گستر، اور ایسے ہی ہزاروں عنوانات پر اسلامی عقیدوں کا دفتر نایاب، یہ کتاب اسلامی عقیدہ اور دیوبند کے مکتبہ فکر کی مکمل ترجمان ہے، اس کی گوناگوں خصوصیات ہی کی بنار پر حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری مرحوم فرماتے تھے کہ:-

"اسلامی عقیدہ کے سلسلہ میں ایسی نایاب و نادر کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔"

یہ حضرت شیخ عبد الحق محدّث دہلوی مرحوم جو ہندوستان میں فن حدیث کے امام اور سرخیل ہیں کی ایک فارسی کتاب "تکمیل الایمان" کا مکمل اردو ترجمہ ہے، جابجا، مترجم کے قلم سے نادر و نایاب حاشیے درج ہوئے ہیں شروع میں علم عقائد و کلام پر ایک مبسوط مقدمہ، جس میں "کلام" کے تمام مکاتیب فکر کی تاریخ، اس علم کے مختلف مراحل اور موڑ، سامنے آگئے۔ کتاب پریس میں جاچکی ہے۔ جلی اور روشن کتابت، خوبصورت ٹائٹل، وڈسٹ کور، ظاہری اور معنوی خوبیوں کا حسین ترین مرقع۔ آرڈر جلد بک کرلیجئے۔ ایک اڈیشن ختم ہوچکا، کہیں ایسا نہ ہو کہ انتظار کرنا پڑے۔ پاکستانی خریدار ڈاک خرچ و قیمت کا منی آرڈر حسب ذیل پتہ پر کرکے رسید ہم کو بھیجدیں۔ قیمت غیر مجلد تین روپے پچیس پیسے، مجلد تین روپے پچھتر پیسے

ہندوستانی پتہ یہ ہے :-	پاکستانی پتہ یہ ہے :-
خضر راہ بک ڈپو دیوبند ضلع سہارنپور یوپی (انڈیا)	حضرت مولانا محمد صاحب انوری مکان ۲۲۳ مین بازار سنت پورہ لائل پور (مغربی پاکستان)

فہرست مضامین ابن جریر طبری اردو سیقول ۲

دو نادر تحقیقات

از مفتئ اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ

رویت ہلال ہوائی جہاز، ریڈیو، وائرلیس، تار، ٹیلیفون سے ملنے والی اطلاعات پر شرعی نقطۂ نظر سے مفصل بحث۔ کیا عیدین اور رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں مذکورہ بالا ذرائع سے ملنے والی خبروں پر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ پوری وضاحت سے شرعی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے، سائنسی اور تاریخی مواد کی روشنی میں!۔

فوٹوگرافی کے شرعی مسائل فوٹوگرافی کی شرعی حیثیت، فوٹو اور آئینہ کے عکس کا فرق، تفصیل کے ساتھ دلائل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

اہلِ رائے کی نظر میں

تفسیر ابن جریر طبری اردو۔ بیت الحکمت دیوبند

(۱) مفسّرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کا تبصرہ "صدقِ جدید" میں

"امام ابن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان کا پایہ عربی تفسیروں میں کیا بہ لحاظ قدامت و استناد، اور کیا بہ لحاظ جامعیتِ مباحث یقیناً بلند و معروف ہے۔ وہ کسی صراحت و بیان کا محتاج نہیں۔ علوم قرآنی سے شُدبُد رکھنے والا بھی اس کے مرتبۂ علمی سے واقف ہے۔ اُردو دانوں کی خوش قسمتی ہے کہ تفسیر موصوف اب اردو میں منتقل ہو کر آرہی ہے۔ اور پارۂ اول تین حصّوں میں منقسم ہو کر اس وقت تک منتقل ہو چکا ہے۔ یہ تفسیر بے بدل اردو دانوں کے حق میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ مترجم نے یہ بھی اچھا کیا ہے کہ زیادہ دقیق لغوی بحثیں ترجمہ میں نظر انداز کر دی ہیں۔"

(ہفتہ وار "صدقِ جدید" لکھنؤ ۱۶ر شوال المکرم ۱۳۸۴ھ)

---

(۲) مولانا سعید احمد اکبرآبادی، صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا تبصرہ "برھان" میں

"تفسیر ابنِ جریر طبری قدیم تفسیر ہے اور اپنی بعض علمی و تحقیقی خصوصیات کے لحاظ سے بعض مشہور و متداول کتبِ تفسیر سے فائق ہے، زیرِ تبصرہ کتاب جس کے اب تک تین حصے شائع ہو چکے ہیں، اس کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ ہے، کہیں مختصر تشریحی حواشی بھی لائق مترجم کے قلم سے ہیں۔ اس تفسیر کے مضامین پر حاوی ہو جانے سے ایک غیر عالم بھی اچھا خاصہ عالم بن سکتا ہے۔"

(ماہنامہ "برہان" دہلی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى

حرمت والا مہینہ ہے بعوض حرمت والے مہینے کے اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں سو جو تم پر زیادتی

عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ

کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا

اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں۔ اور

بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ ج وَاَحْسِنُوْا ۛ ج اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو اور کام اچھی طرح کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو

"اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ"۔ "شہر حرام" سے مراد ذی قعدہ ہے، اسی مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ حدیبیہ کا احرام باندھا تھا اور مکہ کے مشرکین نے آپ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا تھا یہ واقعہ سنہ ۶ھ میں پیش آیا تھا۔ لیکن آں حضورؐ نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ آئندہ سال آپ تشریف لاکر عمرہ کریں گے اور مکہ معظمہ میں تین دن قیام کریں گے۔ چناں چہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ اگلے سال ۷ھ میں، اسی ذی قعدہ کے مہینے میں جس میں مشرکین نے آپؐ کو روکا تھا، مکہ معظمہ تشریف لائے۔ مکہ والوں نے آپؐ کے لیئے شہر خالی کردیا۔ آں حضورؐ نے وہاں تین دن قیام کیا اور عمرہ پورا کیا۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ کے لیئے وہاں سے نکل پڑے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ اور مسلمانوں سے ارشاد فرمایا کہ "حرمت والا مہینہ"، جس میں اللہ تعالیٰ نے تمھیں مشرکین کے علی الرغم مکہ معظمہ تک پہنچایا اور تمھیں عمرہ ادا کرنے کا موقعہ دیا اس "حرمت والے مہینے کے بدلے میں ہے"، جس میں گذشتہ سال تمھیں مشرکین قریش نے مکہ میں داخل ہونے سے روکا تھا، اور تم ناگواری کے ساتھ واپس آگئے تھے اور بیت اللہ تک پہنچنا تمہارے لیئے ممکن نہ ہوسکا تھا۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسی کا بدلہ دیا ہے کہ مشرکین نے تمھیں جس مہینے میں گذشتہ سال تمہاری ناگواری کے باوجود واپس کردیا تھا، اسی مہینے میں اب مشرکین کی ناگواری کے باوجود تمھیں بیت اللہ پہنچا رہا ہے۔ آیت کی یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سدی، ضحاک، ربیع، ابن زید اور عطاء رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ قتادہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کا احرام باندھ کر ذی قعدہ کے مہینے میں آئے، آپؐ کے ساتھ ہدی بھی تھی۔ جب آپؐ مقام حدیبیہ پر پہنچے تو مشرکین قریش نے آپؐ کو مکہ میں داخلہ سے روکا پھر آں حضورؐ نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ اس سال تو آپؐ واپس چلے جائیں گے، لیکن آئندہ سال تشریف لائیں گے اور مکہ معظمہ میں تین دن تک قیام کریں گے۔ مکہ میں اپنے ساتھ سواروں کے ہتھیار کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ لائیں گے۔ مکہ سے واپس ہوتے ہوئے وہاں کے کسی بھی فرد کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے

چنانچہ مسلمانوں نے اپنی قربانی کے جانور حدیبیہ میں ہی ذبح کر دیئے اور وہیں سر منڈا لیا یا قصر کرا لیا۔ پھر شرط کے مطابق اگلے سال آں حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ مکہ میں داخل ہوئے اور ذی قعدہ ہی کے مہینے میں عمرہ کیا اور تین دن تک وہاں قیام کیا۔ مشرکین نے ایک سال پہلے آں حضورؐ کو واپس کر کے بڑا فخر کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دوسرے سال اس کا بدلہ دے دیا اور اسی مہینے میں انھیں مکہ معظمہ پہنچایا جس میں قریش نے انھیں واپس کیا تھا اسی کے متعلق مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ "وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ" (اور حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں) کا یہی مطلب ہے۔ سدی کی روایت میں ہے کہ صلح کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے سال ۷ھ میں خیبر کی فتح کے بعد مکہ معظمہ عمرہ کی قضاء کے لیئے تشریف لائے تھے۔ مشرکین نے مسلمانوں کے لیئے تین دن کے لیئے مکہ خالی کر دیا۔ آں حضورؐ نے اسی عمرہ کے موقعہ پر میمونہ بنتِ حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ذی قعدہ کو "الشہر الحرام" (حرمت والا مہینہ) اس لیئے فرمایا کہ عرب جاہلیت میں اس مہینہ میں بھی جنگ اور قتل کو حرام سمجھتے تھے، ہتھیار رکھ دیتے تھے اور اس میں کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا تھا، اگر کوئی شخص اس مہینے میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی پالیتا تو اس سے کوئی تعارض نہیں کرتا تھا۔ اس مہینے کا نام ذوالقعدہ (قعد بمعنی بیٹھنے سے) اس لیئے رکھا تھا کہ اس میں وہ جدال و قتال سے بیٹھ رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کا یہ نام باقی رہنے دیا۔ "حُرُمَاتُ" "حُرْمَةٌ" کی جمع ہے اللہ تعالیٰ نے "وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ" (اور حرمتیں تو عوض و معاوضہ کی چیزیں ہیں) میں جمع کا صیغہ اس لیئے استعمال کیا کہ اس سے مراد حرمت والا مہینہ، حرمت والا شہر اور احرام کی حرمت سب ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ حرم میں احرام باندھ کر حرمت والے مہینے میں تمہارا داخل ہونا اس کا بدلہ ہے کہ تمھیں اسی حالت میں اس سے ایک سال پہلے حرم میں داخلہ سے روکا گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم قصاص کا مفہوم بیان کر چکے ہیں کہ عملی، قولی یا جسمانی کسی حیثیت سے بدلہ کے معنیٰ میں ہے۔ آیت میں مراد عمل کا بدلہ ہے۔

"فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ" (پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے)۔ آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔ مسلمانوں کی تعداد ان دنوں بہت کم تھی۔ انھیں کسی طرح کا غلبہ بھی حاصل نہیں تھا کہ مشرکین ان سے ڈرتے، اس لیئے انھیں ہر وقت مشرکین کے آوازے، ان کی گالیاں اور دشنام طرازیاں سہنی پڑتی تھیں۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اگر کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ کسی مشرک کی دشنام طرازی کا جواب دے سکے تو اسے جواباً ویسا ہی اقدام کرنا چاہیئے جیسا کہ مشرک نے کیا ہے، یا پھر صبر کرنا چاہیئے اور معاف کر دینا چاہیئے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عزت اور حکومت دی تو مسلمانوں کو حکم ہوا کہ آپس کے معاملات اور جھگڑوں میں اپنے امیر و حاکم کی طرف رجوع کریں اور ان کے فیصلہ کے مطابق عمل کریں، جاہلیت کی طرح ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اے مسلمانو! مشرکین کے جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی ان سے جنگ کرو، جیسا کہ وہ تم سے جنگ کرتے ہیں"۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ میں عمرہ قضا کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ قول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

میرے نزدیک مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول قابل ترجیح ہے۔ آیت کی ترتیب اور اس کے الفاظ سے صاف یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ جنگ کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ مشرکین تمہارے ساتھ جیسا معاملہ کریں تم بھی ان کے ساتھ وہی معاملہ کرو، ہاں اس میں حد سے آگے نہ بڑھو۔ زیر تفسیر آیت جب ایسی آیات کے ساتھ ذکر ہو رہی ہے جن کا تعلق جنگ اور جہاد سے ہے، اور یہ معلوم ہے کہ جہاد مسلمانوں پر مدینہ کی ہجرت کے بعد فرض ہوا ہے، تو یہ آیت بھی مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہوگی، مکہ میں اسکے نازل ہونے کا کوئی بھی واضح ثبوت نہیں ہے۔ اس آیت سے بھی بالکل اسی طرح کا مفہوم نکلتا ہے جیسا اس سے پہلے کی آیت سے نکلتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کوئی بھی تم پر حملہ آور ہو یا کوئی ظالمانہ اقدام کرے تو تم اس کا جواب اسی شدت کے ساتھ دو، تاکہ اس طرح اپنے دشمن سے اس کے ظالمانہ اقدام کا بدلہ لے سکو، تمہارا یہ اقدام ظلم نہیں کہلائے گا۔

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ" یعنی اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود اور حرمتوں کے بارے میں اس سے ڈرتے رہو، اس سے سر مو تجاوز نہ کرو، اور جان لو کہ اللہ انھیں کو پسند کرتا ہے جو اس کے فرائض کی ادائیگی اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے دور رہ کر تقویٰ کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔

"وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" آیت کی تفسیر میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ "وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو) میں "اللہ کے راستے" سے مراد مشرکین و کفار سے جہاد کا راستہ ہے، یعنی ان سے جہاد اور جنگ کے لیے مال بھی خرچ کرو (جان کی قربانی تو دیتے ہی ہو)۔ "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" (اور اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالو) سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے اس راستے میں خرچ سے ہاتھ نہ کھینچو اللہ تعالیٰ تمھیں اس خرچ کا بدلہ دے گا، اور اس دنیا میں بھی تمہارا یہ انفاق تمہاری روزی کا سبب بن جائے گا۔ چناں چہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" سے مراد (اللہ کے راستے میں) خرچ نہ کرنا ہے (کہ یہ ہلاکت و تباہی کا باعث ہوگا)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ جنگ میں قتل ہو جانا باعث ہلاکت نہیں ہے، بلکہ اللہ کے راستے میں جنگ کے لیے خرچ نہ کرنا باعث ہلاکت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس تھوڑا سا سامان ہے تو اسے بھی اللہ کے راستے میں دے ڈالو۔ عکرمہ، محمد بن کعب قرظی، مجاہد، حسن، قتادہ، سدی، عطاء اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی یہی تفسیر روایت ہے کہ "جہاد میں اپنا مال بھی خرچ کرو، اور اس خرچ کو روک کر اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو"۔

آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ "اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور خود ہی اپنی جانوں کو تباہی میں نہ ڈالو یعنی بغیر تیاری اور کھانے پینے کے سامان کے نہ نکلو، کہ یہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کرنے کے مترادف ہے"

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "خود کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالو، کہ جو گناہ تم سے سرزد ہو چکے ہیں ان کی توبہ کے بارے میں مایوس ہو جاؤ، بلکہ اللہ کی رحمت سے امید رکھو اور عمل کیئے جاؤ۔" یہ تفسیر براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا، اگر میں تنہا مشرکین پر حملہ کر دوں اور وہ مجھے قتل کر دیں تو کیا یہ بھی اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، آیت کا تعلق خرچ کرنے سے ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا اور ان سے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جنگ کیجئے، آپ پر صرف آپ ہی کی تنہا ذمہ داری ہے، دوسروں کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ سے کسی نے پوچھا، کیا اس آیت میں ایسے شخص کا ذکر ہے جو آگے بڑھ کر جنگ کرتا ہے اور شہید کر دیا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ آیت کا تعلق ایسے شخص سے ہے جو گناہ کرتا ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر توبہ نہیں کرتا اور اس طرح اپنی جان کو خود تباہی میں ڈالتا ہے۔" عبیدہ سلمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں آپ سے نقل ہے کہ "اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو" سے مراد "مایوسی" ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ "اللہ کے راستے میں جہاد کرنا نہ چھوڑو کہ یہ خود اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔" اسلم بن عمران سے روایت ہے کہ ہم نے قسطنطنیہ کی جنگ لڑی، مسلمانوں کی فوج کے مصری دستہ کے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ امیر تھے اور دوسرے دستے کے امیر عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ بیان کیا کہ ہم نے اپنی فوج کی دو صفیں بنائیں، میں نے ان دو صفوں سے زیادہ لمبی اور چوڑی صف کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رومی شہر پناہ کی دیوار سے بالکل لگے ہوئے کھڑے تھے۔ ہماری فوج کے ایک سپاہی نے نکل کر دشمن پر حملہ کرنا چاہا تو لوگوں نے کہا کہ ٹھہر جاؤ، اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اپنی جان کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی میں ڈالتے ہو! ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اس پر فرمایا کہ قرآن کی جس آیت کی روشنی میں تم لوگ منع کر رہے ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مدد کی اور اسلام کو غالب کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں لائے بغیر ہم انصار نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب تک ہم لوگ اپنے گھر بار اور مال جائداد کو چھوڑے ہوئے تھے اور اس کے سدھار کی ہم نے کوئی فکر ہی نہیں کی، کیا اب، جب کہ اللہ نے اپنے نبیؐ کی مدد کی اور اسلام کو غالب کر دیا ہے ہمیں اپنے گھر ٹھہر کر اپنے مال جائداد کی فکر اور اس کی اصلاح و سدھار کرنی چاہیئے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ "اللہ کے راستے میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو خود ہی تباہی میں نہ ڈالو۔" تو خود ہی اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جہاد چھوڑ کر اپنے گھر بیٹھ رہیں اور اپنے مال و اولاد کی فکر میں لگ جائیں۔ ابو عمران نے بیان کیا کہ پھر ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ مسلسل اللہ کے راستے میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں آپ مدفون ہوئے۔ اسلم بن عمران ہی کی ایک دوسری روایت میں جو محمد بن عمارہ اسدی سے روایت ہے یہ ہے کہ مصریوں کے امیر عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور اہل شام کے امیر فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔

میرے نزدیک آیت کی بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے "اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو" اور اللہ نے اپنے راستے کی خود وضاحت کردی ہے، مطلب یہ ہے کہ میرے دین کی سربلندی کے لیے خرچ کرو، جو میں نے تمہارے لیے تمہارے اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مشروع کیا ہے۔ پھر مسلمانوں کو اس سے روکا کہ خود اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالیں، ارشاد ہوا کہ "اور خود اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو"۔ یہ ایک محاورہ ہے، اہل عرب سپردگی کے لیے بولتے تھے "أَعْطَى فُلَانٌ بِيَدِهِ" فلاں نے اپنے آپ کو سپرد کردیا، ہتھیار ڈال دیا۔ اس محاورہ کی روشنی میں "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو تباہی کے سپرد مت کرو۔ اور "اللہ کے راستے میں"، جب خرچ کرنا ضروری ہو تو اسے چھوڑنے والا اور اس سے غفلت برتنے والا انسان اپنے آپ کو تباہی و بربادی ہی کے سپرد کرتا ہے، اللہ نے فرض صدقہ (زکات) کے خرچ کے لیے جو آٹھ مصرف بتائے ہیں ان میں ایک "اللہ کے راستے میں" خرچ کرنا بھی ہے "وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ" اس لیے اس فرض کے چھوڑنے والے کے متعلق کیسے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو تباہی کے سپرد نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہے اور وہ اس کی توبہ کے بارے میں اللہ کی رحمت سے مایوس ہے تو یقیناً وہ بھی اپنے آپ کو تباہی کے سپرد کرتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے کہ "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، کہ اللہ کی رحمت سے کافر قوموں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا"۔ یہی حال اللہ کے راستے میں جہاد کا بھی ہے، جب جہاد مسلمانوں کے لیے ضروری ہو اور ان کی مصلحت کا تقاضا ہو اور کوئی قدرت رکھتے ہوئے اس میں شرکت نہ کرے تو وہ خود کو تباہی کے سپرد کرتا ہے۔ پس جب آیت "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" میں مذکورہ تمام ہی اقوال کی گنجائش ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آیت میں ان میں سے کسی خاص مفہوم کی تخصیص بھی نہیں کی ہے تو آیت کا ایک عام مفہوم ہی مراد لینا صحیح ہوگا، اور تفسیر ہم اس طرح کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنے سے منع کیا ہے اور ہر اس چیز سے روکا ہے جو ہماری بربادی (تباہی) کا موجب ہو۔ یہ ایک عذاب ہے جو ہم پر اللہ تعالیٰ کے فرائض کو چھوڑنے کی صورت میں ہوگا، اور ہمارے لیے کسی درجہ میں بھی یہ جائز نہیں کہ وہ عمل کریں جو اللہ کے عذاب کا موجب ہو۔ آیت کے اس عام مفہوم کی روشنی میں تفسیر یہ ہوگی کہ "اے مسلمانو! اللہ کے راستے میں خرچ کرو، اور اللہ کے راستے میں خرچ کو نہ چھوڑو کہ یہ تمہاری تباہی کا موجب ہے، کیونکہ اس بدعملی کے نتیجہ میں تم میرے عذاب کے مستحق ٹھہروگے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آیت میں "تھلکۃ" سے مراد اللہ کا عذاب ہے۔ گویا آیت میں پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا، پھر تنبیہ کی گئی کہ یہ خرچ تم پر فرض ہے اور اس کا چھوڑنا آخرت کے عذاب کا باعث ہے۔

"تھلکۃ" ھلاک سے تفعلۃ کے وزن پر ہے۔

"وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" یعنی اے مسلمانو! جو کچھ میں نے تمہارے لیے ضروری قرار دیا ہے ان کی ادائیگی اچھی طرح کرو، میرے فرائض کی بجا آوری، محرمات سے اجتناب، میرے راستے میں انفاق اور جو لوگ تم میں باحیثیت ہیں وہ کمزوروں کی پرسش احوال دل سے اور خوب اچھی طرح کریں، کیونکہ

ص اور لگاوٹ کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہوں۔ ابو اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رضؓ کے واسطہ سے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "اَحْسِنُوْا" کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اچھا گمان رکھو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر نقل ہوئی ہے کہ محتاجوں کی خبر گیری اچھی طرح کرو۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ

اور (جب حج وعمرہ کرنا ہو تو اس) حج وعمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو۔ پھر اگر (کسی دشمن یا مرض کے سبب) روک دیئے جاؤ تو قربانی

مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ

کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرو)۔ اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (اور وہ موقع

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ

حرم ہے کہ کسی کے ہاتھ وہاں جانور بھیج دیا جاوے) البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو (جس سے پہلے ہی سر منڈوانے کی ضرورت پڑ جائے) تو

مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۗ فَمَنْ

(وہ سر منڈوا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی) دیدے (تین) روزے سے یا (چھ مسکین کو) خیرات دیدے یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے۔ پھر جب امن کی حالت میں تم

تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ

(یا تو پہلے ہی سے کوئی خوف پیش نہ آیا ہو یا ہو کر جاتا رہا ہو) تو جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا ہو (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کر لیا ہو) تو جو کچھ قربانی میسر ہو

لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ

(ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ یا حج کیا ہو اس پر حج وغیرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ تین دن کے روزے ہیں (ایام

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى

حج میں اور سات ہیں جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آجاوے یہ پورے دس ہوئے یہ اس شخص کے لیئے ہے جس کے اہل (وعیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۟ ع ۸

قرب میں نہ رہتے ہوں (یعنی قریب ہی کا وطن دار نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہو جائے) اور جان لو کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ (دنیا کی اور

(مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں ؛

حج کے چند احکام

"وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" مفسرین کے اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ "حج کو اس کے مناسک اور اس کی سنتوں کے ساتھ پورا

کرو، اور عمرہ کو بھی اس کے حدود اور اس کی سنتوں کے ساتھ پورا کرو"۔ اس مفہوم کے لیے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے "وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ اِلَی الْبَیْتِ"، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول اس روایت کا ذکر سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے کیا تو انھوں نے کہا کہ اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا تھا۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی قراءت "وَ اَقِیْمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ اِلَی الْبَیْتِ"، نقل ہوئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بواسطہ علی بن ابی طلحہ ایک روایت میں "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" ہی ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے حج کا احرام باندھا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ قربانی کے دن حج کے پورے ہونے سے پہلے حلال ہو جائے، جب جمرہ عقبہ کی رمی کرے اور طواف زیارت سے فارغ ہو جائے پھر حلال ہو گا اسی طرح عمرہ پورا اس وقت ہو گا جب بیت اللہ کا طواف اور صفا اور مروہ کی سعی کرے گا، پھر عمرہ کے احرام سے حلال ہو گا۔ مجاہد، علقمہ، ابراہیم اور ربیع رحمہم اللہ سے بھی اسی مضمون کی روایتیں نقل ہوئی ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "حج اور عمرہ کا پورا کرنا" یہ ہے کہ حج اور عمرہ کے لیے الگ الگ مستقل سفر کرے اور اپنے گھر سے احرام باندھ کر جائے"، اس کی روایت علی رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر اور طاؤس رحمہما اللہ سے ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "عمرہ کا پورا کرنا" یہ ہے کہ حج کے مہینوں کے سوا کسی اور مہینے میں اس کے لیے مستقل احرام باندھے اور "حج کا پورا کرنا" یہ ہے کہ حج کے تمام مناسک اس خوبی کے ساتھ ادا کیے جائیں کہ عامل پر قران یا تمتع کی وجہ سے .... کوئی قربانی نہ ضروری ہو۔ اس کی روایت قتادہ اور قاسم بن محمد رحمہما اللہ سے ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ "دونوں کے پورا کرنے"، کا مفہوم یہ ہے کہ گھر سے انھیں کے ارادے سے نکلے، کوئی بھی دوسرا مقصد اس سفر کا نہ ہو"۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "حج اور عمرہ کو پورا کرنے"، کا مفہوم یہ ہے کہ گھر سے صرف حج اور عمرہ کے ارادہ سے نکلے، پھر میقات پر پہنچ کر احرام باندھے، سفر کا مقصد کوئی تجارت یا کوئی اور ضرورت نہ ہو، کہ مکہ معظمہ کے قریب پہنچ کر سوچنے لگے کہ اگر حج بھی کر لیا جائے تو کیا حرج ہے!۔ اس طرح کا حج اگرچہ ادا تو ہو جاتا ہی لیکن حج کامل اسی وقت ہوتا ہے جب گھر سے سفر ہی اس مقصد سے کرے کوئی اور مقصد نہ ہو"۔

پانچواں قول یہ ہے کہ "حج اور عمرہ پورا کرو، یعنی جب شروع کر دو تو پورا کرو"۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عمرہ کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس پر مذکورہ بالا آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا کہ کسی کے لیے مناسب نہیں کہ کوئی کام شروع کر کے اسے ادھورا چھوڑ دے، اس لیے جب احرام باندھ لیا تو بغیر ادائیگی کے واپس لوٹ آنا بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی روزہ رکھتا ہے تو اس کے لیے بھی جائز نہیں کہ آدھے دن روزہ رکھ کر اسے توڑ دے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عمرہ نفل ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ حج کو پورا کرو اور عمرہ اللہ کے لیے ہے۔ یہ مفہوم اس صورت میں لیا جا سکتا ہے جب "العمرۃ" کا عطف "الحج" پر نہ ہو۔ بلکہ "العمرۃ" پر رفع پڑھا جائے۔ آیت کی ایک قراءت یہ بھی ہے۔ ابو بردہ اور شعبی رحمہما اللہ کا اس مسئلہ پر مذاکرہ ہوا تھا، ابو بردہ کا خیال تھا کہ عمرہ واجب ہے اور شعبی رح نے فرمایا کہ نفل ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول تو یہی ہے، لیکن آپ سے اس کا فرض ہونا بھی نقل ہے۔ مغیرہ رحمۃ اللہ علیہ آپ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔ اس کا فرض ہونا مسروق، علی بن

حسین، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی نقل ہے۔ آپ حضرات دلیل میں یہی آیت رکھتے ہیں کہ "اور پورا کرو حج کو اور عمرہ کو"۔ مسروق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں یہی چار چیزوں کا حکم دیا گیا ہے، نماز قائم کرنے کا، زکات دینے کا اور حج اور عمرہ کی ادائیگی کا۔ پھر آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی۔ اس قول کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، اس لیے کہ یہ دونوں فرض ہیں، اللہ کی طرف سے ان کو قائم کرنے کا اسی طرح حکم ہے جس طرح نماز قائم کرنے کا۔ حج کی طرح عمرہ کی بھی فرضیت کے قائل صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے اہل علم کی ایک بڑی جماعت ہے۔ ہم نے ان کی اور ان سے منقول روایات کی تفصیل اس موقع پر مناسب نہیں سمجھی۔ ان حضرات کے نزدیک "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" کا مطلب ہے "اور حج اور عمرہ کو قائم کرو"۔ علی، عبداللہ رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ معنی نقل ہوئے ہیں۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل ہے کہ آپ نے فرمایا، اگر دشواری اور حرج نہ ہوتا، اور یہ وجہ بھی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی حدیث نہیں سنی۔ تو میں کہہ دیتا کہ عمرہ بھی اسی طرح فرض ہے جیسے حج، ان کی ادائیگی ان کے حدود اور فرائض کے ساتھ کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عمرہ کے متعلق نقل ہے کہ یہ نفل ہے، حج کی طرح فرض نہیں۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عمرہ واجب نہیں ہے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عمرہ سنت حسنہ ہے۔ عبداللہ بن عون بھی شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی قول نقل کرتے ہیں۔

میرے نزدیک آیت کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ "العمرۃ" کا عطف "الحج" پر ہو اور دونوں کو نصب پڑھا جائے یعنی آیت میں دونوں کو پورا کرنے کا حکم ہے، کیونکہ "نصب" کی قراءت پر تمام معتمد روایتوں کا اتفاق ہے، خود اسی سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جنھوں نے "العمرۃ" پر نصب کے بجائے رفع پڑھا ہے "العمرۃ" پر جو حضرات نصب پڑھتے ہیں ان میں بعض حضرات عمرہ کو واجب اور بعض نفل کہتے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہے کہ عمرہ نفل و سنت ہے، اور میری رائے بھی یہی ہے۔ اصل میں آیت سے دونوں ہی مفہوم مراد لیے جا سکتے ہیں، اسے نفل بھی کہا جا سکتا ہے اور واجب بھی۔ اگرچہ بعض روایات سے اس کے وجوب کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، مثلاً ابو المنفق رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میدان عرفہ میں حاضر ہوا، میں آپؐ کے اتنا قریب ہو گیا کہ آں حضورؐ کی سواری کی گردن اور میری سواری کی گردن مل گئی، پھر میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے ایسے عمل بتا دیجیے جو مجھے اللہ کے عذاب سے نجات دلا دیں اور اللہ ان کی وجہ سے مجھے اپنی جنت میں داخل کر دے؟ حضور اکرمؐ نے فرمایا، اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پابندی اور آداب کی پوری رعایت کے ساتھ ادا کرتے رہو، فرض زکات ادا کرتے رہو، حج کرو، عمرہ کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اس پر نگاہ رکھو کہ اپنے ساتھ لوگوں کے کس طرح کے معاملہ کو تم پسند کرتے ہو، ویسا ہی معاملہ تم بھی لوگوں کے ساتھ کرو، اور جن چیزوں کو تم نہیں پسند کرتے کہ تمہارے ساتھ دوسرے لوگ کریں وہ تم بھی لوگوں کے ساتھ نہ کرو۔

بنی عامر کے ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میرے والد بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان میں حج کرنے کے لیے سفر وغیرہ کی سکت باقی نہیں رہ گئی ہے، وہ اسلام بھی قبول کر چکے ہیں، تو کیا میں

ان کی طرف سے حج کروں؟ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرلو۔ ابو قلابہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں فرمایا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ، نماز قائم کرو، زکات دو، حج اور عمرہ کرو اور سیدھے طریقہ پر رہو، تمہارے لیئے بھی ہر چیز درست اور سیدھی ہوجائے گی۔ لیکن یہ اور اس مفہوم کی دوسری احادیث دین میں کسی اصول وضابطہ کے لیئے کوئی حجت نہیں بن سکتیں، خصوصاً جب کہ ان روایتوں کی اسانید بھی کمزور ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بہت سی دوسری روایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمرہ نفل ہے، واجب و فرض نہیں ہے۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا یہ بھی واجب ہے؟ آں حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں، ہاں اگر عمرہ کرو تو یہ تمہارے لیئے بہتر ہے۔ ابو صالح حنفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔ اس لیئے میرے نزدیک آیتِ مذکورہ کی قراءتوں میں راجح قراءت "العمرۃ" پر نصب کی ہے، اور اقوال میں راجح قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے جو ان سے علی بن ابی طلحہ نے نقل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے شروع کرنے کے بعد انھیں پورا کرنے کا آیت میں حکم دیا ہے کہ اب دونوں کو ان کے تمام حدود اور سنتوں کی رعایت کے ساتھ ادا کیا جائے اور عمرہ کے سلسلے میں راجح قول یہ ہے کہ یہ نفل ہے، فرض نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت عمرہ حدیبیہ کے موقع پر نازل کی تھی جب آپؐ کو مشرکینِ مکہ نے مکہ کے داخلہ سے روک دیا تھا، جب کہ آپؐ اور آپ کے ساتھ صحابہؓ احرام باندھے ہوئے تھے۔ اگر بیت اللہ تک آپ حضرات کو جانے دیا جاتا پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی، لیکن اب یہ سوال تھا کہ اس احرام سے نکلنے کی کیا صورت ہے، یا کسی بھی شخص کو اگر بیت اللہ جانے سے راستے میں روک دیا گیا اور وہ احرام باندھ چکا ہے تو احرام سے نکلنے کی کیا صورت ہوگی؟ ارشاد ہے "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" (پھر اگر رکنا پڑ جائے تو جو بھی قربانی کا جانور میسّر ہو) مفسرین سے آیت کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں کہ "أُحْصِرْتُمْ" (رک جانا) سے کیا مراد ہے کہ جو شخص اس صورت حال سے دوچار ہو اسے اجازت ہے کہ جو بھی قربانی کا جانور میسّر ہو اس کی قربانی کردے؟۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کے مفہوم میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جو محرم کو احرام سے متعلق فریضہ کی ادائیگی اور بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "حصر" روکنے کے معنیٰ میں ہے، جس شخص کے لیئے بھی کوئی عذر حج یا عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے اسے اپنی قربانی کا جانور وہیں سے بھیج دینا چاہیئے جہاں وہ رک گیا ہے۔ آپ نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص مرض یا کسی بھی عذر شرعی کی وجہ سے رُک گیا تو اس پر حج یا عمرہ کی ادائیگی کا قرض باقی رہے گا اور اسے چاہیئے کہ جو بھی قربانی کا جانور اسے میسّر ہے اسے بھیج دے اور یوم النحر (دسؔ ذی الحجہ) سے پہلے نہ سر منڈوائے اور نہ احرام کھولے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ہر وہ چیز جو رکاوٹ کا باعث بن جائے "احصار" کے مفہوم میں داخل ہے"۔ قتادہ نے فرمایا کہ "روکنے والی چیزیں خوف اور مرض ہیں"۔ مذکورہ بالا اقوال کے مطابق عروہ اور ابراہیم رحمہما اللہ سے بھی تفسیر منقول ہے۔ ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں نقل ہے کہ کسی شخص نے حج یا عمرہ کے لیے احرام باندھا، لیکن درمیان میں بیمار پڑ گیا اور بیماری بھی ایسی تھی جس نے بیت اللہ تک پہنچنا اس کے لیے مشکل بنا دیا، یا اسی طرح کا اور کوئی عذر پیش آگیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس حج اور عمرہ کی آئندہ قضا کرے (اور اس وقت قربانی ذبح کر کے احرام کھولدے) آیت کا یہ مفہوم مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ کلام عرب میں "احصار" کے معنی "کسی سبب و عذر کا رکنے کا باعث بن جانا ہے" جیسے مرض یا اسی طرح کے اور بہت سے اعذار۔ زبردستی کسی چیز سے روک دینا اس کے مفہوم سے خارج ہے۔ اس کے مفہوم میں مرض، سانپ وغیرہ کا ڈس لینا، زخمی ہو جانا، سفرخرچ کا کم ہو جانا یا سواری کا ٹوٹ جانا شامل ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی کو دشمن نے روک دیا اور بیت اللہ تک پہنچنے نہیں دیا یا قید خانہ میں بند کر دیا یا اسی طرح کی کوئی اور صورت پیش آئی جس میں کسی غالب اور قوی تر انسان یا جماعت نے زبردستی مزاحمت کی اور محرم کو بیت اللہ تک جانے نہیں دیا تو اس کے لیے عرب مجرد کا صیغہ "حصر" استعمال کرتے ہیں، مزید کا "احصار" استعمال نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی آیت "وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا" (اور جہنم کو ہم نے کافروں کا قیدخانہ بنا ہی رکھا ہے) سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ دشمن کے محاصرہ و مزاحمت کے مواقع کے لیے بکثرت کلام عرب میں اس کا استعمال ہوا ہے، "اَلْعَدُوُّ مُحَاصِرٌ"، "هُمْ مَحْصُوْرُوْنَ"، "حُوْصِرَ الْعَدُوُّ" تو استعمال ہوا ہے لیکن کہیں بھی "اُحْصِرَ الْعَدُوُّ" نہیں مل سکتا۔ اس کے بالمقابل مرض یا خوف یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذر کی وجہ سے رک جانے کے لیے "اُحْصِرَ الرَّجُلُ" استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے آیت میں مرض، خوف یا اس طرح کے دوسرے اعذار کا بیت اللہ تک پہنچنے سے مانع آنا تو اصل مفہوم ہوگا، لیکن تبعاً دشمن یا کسی غالب و قوی کے روک دینے کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا اور حکم دونوں صورتوں میں یہی رہے گا کہ اگر بیت اللہ تک وہ نہ پہنچ سکا تو اپنی قربانی کا جانور بھیجدے اور جب قربانی اپنے مقام پر پہنچ کر ذبح کر دی جائے تو احرام کھولدے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "اگر تمھیں دشمن یا کوئی غالب و قوی انسان بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دے"، ان حضرات کا خیال ہے کہ جسمانی اعذار، مثلاً بیماری، یا زخم وغیرہ۔ آیت کے الفاظ "فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ" میں داخل نہیں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "حصر" کا مفہوم تو صرف دشمن کے روکنے ہی کی صورت میں پایا جاتا ہے، پھر بھی اگر کوئی بیماری کی وجہ سے رک گیا تو اس اجازت سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر اس کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے تو جہاں رکا ہوا ہے وہیں بغیر قربانی کے احرام کھول دے اور اگر قربانی ساتھ ہے تو اس وقت تک احرام نہ کھولے جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ لگ جائے آپ نے فرمایا کہ جب روک دیئے جانے والے محرم نے قربانی بھیجدی تو اب اس پر آئندہ حج یا عمرہ فرض نہیں رہتا البتہ اگر چاہے تو کر سکتا ہے۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ میں احرام کھول دیا تھا، قربانی ذبح کر لی تھی، سر منڈوا لیے تھے اور بیت اللہ کے طواف اور وہاں تک قربانی کے جانور کے پہنچنے سے پہلے ہر چیز سے حلال ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کے متعلق ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی، شریک صلح حدیبیہ کے کسی فرد کو حج یا عمرہ کی قضا، کا یا ان کے

اعمال میں سے کسی ایک کے دوبارہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ ایک روایت میں آپؒ سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں محرم احرام کھول دے گا اور ہر چیز سے حلال ہو جائے گا، اور جہاں اسے روکا گیا ہے وہیں اپنا سر منڈا لے اور اپنی قربانی کا جانور ذبح کرے، اس پر اس حج کی قضا واجب نہیں ہے، البتہ اگر اس نے اس سے پہلے کبھی حج ہی نہیں کیا ہو تو اس کے لیئے فریضۂ حج کی ادائیگی (جب کہ شرائط پائی جاتی ہوں) ضروری ہے آپ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک اگر کسی کو حج کرنے سے دشمن نے نہیں روکا، بلکہ مرض یا اس جیسے کسی عذر کی وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہوا تو اسے ناگزیر امور انجام دے لینے چاہئیں اور فدیہ دینا اور اپنے احرام کو عمرہ میں تبدیل کر لینا چاہیئے۔ البتہ اسے اگلے سال حج کرنا چاہیئے اور قربانی کرنی چاہیئے۔ آیت کی اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس موقعہ پر نازل ہوئی تھی جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو بیت اللہ جانے سے روک دیا تھا۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے آں حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو اپنے قربانی کے جانور کے ذبح کرنے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا تھا۔ اس لیئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دشمن کے روک دینے کے موقعہ پر نازل کی، اس لیئے جس خاص موقعہ کے لیئے نازل ہوئی اسی پر اسے محمول کیا جائے گا، اس کے مفہوم میں تبدیلی مناسب نہیں۔ مریض بھی جب شدت مرض کی وجہ سے چل پھر نہ سکتا ہو اور اسی وجہ سے میدانِ عرفہ تک بھی نہ جا سکا ہو تو وہ بھی ان لوگوں میں سمجھا جائیگا جن کا حج چھوٹ جاتا ہے اور اس لیئے اسے بھی چاہیئے کہ قاعدہ کے مطابق احرام کھول دے۔ اسے "محصر" نہیں کہا جائے گا جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے۔

میرے نزدیک اس کی راجح تفسیر یہ ہے کہ "اگر دشمن کا خوف، مرض یا کوئی بھی عذر تمہارے بیت اللہ تک پہنچنے میں مانع بنے، یعنی تمہارا خوف یا مرض تمھیں اس مرحلہ پر لا کھڑا کرے کہ تم اپنے آپ کو بیت اللہ تک جانے سے روک لو اور حج وعمرہ کے وہ اعمال جو تم پر واجب تھے ان کی انجام دہی سے تم رک جاؤ تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اس کی قربانی کر دو۔" "اُحْصِرْتُمْ" کا استعمال اسی لیئے کیا۔ بولتے ہیں "اَحْصَرَنِیْ خَوْفِیْ مِنْ فُلَانٍ عَنْ لِقَائِكَ" (فلاں شخص کے خوف نے مجھے تم سے ملنے نہیں دیا)، مرض کے ساتھ بھی اس کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے، یعنی مجھے مجبور کر دیا کہ میں تم سے نہ ملوں لیکن اگر مانع ومزاحم انسان ہو تو اس موقع کے لیئے "حَصَرَنِیْ فُلَانٌ عَنْ لِقَائِكَ" (مجھے فلاں شخص نے تم سے ملنے نہیں دیا) استعمال کرتے ہیں۔ اگر آیت کا مفہوم وہی ہوتا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لیا ہے تو آیت میں "فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ" کے بجائے "فَاِنْ حُصِرْتُمْ" ہونا چاہیئے تھا۔ آیت میں "اِحْصَار" کے صیغہ کے استعمال سے یہ واضح ہے کہ "انسانی مزاحمت و ممانعت" مراد نہیں ہے، بلکہ انسان یا دشمن کے خوف کا رکاوٹ بن جانا مراد ہے۔ اس کے علاوہ آیت "فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ" (لیکن جب تم حالتِ اطمینان میں ہو تو جو شخص عمرہ سے مستفید ہوا سے حج سے ملا کر) سے بھی ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ امن خوف کے دور ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورتیں جن میں احرام کے بعد انسانی مزاحمت اور رکاوٹ تو پائی جاتی ہے لیکن خوف وخطرہ نہیں ہے تو محرم کے لیئے ضروری ہے کہ احرام نہ کھولے، بلکہ حج یا عمرہ جس کا بھی اس نے احرام باندھا ہے

اسے پورا کرے۔ مثال کے طور پر حاکم یا بادشاہ رکاوٹ بن رہا ہے، لیکن نہ رکنے کی صورت میں اس کی سزا وغیرہ کا کوئی خوف نہیں ہے، یا والد یا عورت کا شوہر مزاحم ہے لیکن نہ رکنے کی صورت میں کوئی خوف وخطرہ نہیں تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں محرم پر لازم ہے کہ جس کا احرام باندھا ہے اسے انجام دے اور احرام نہ کھولے، کیونکہ وہ "محصر" نہیں ہے۔ آیت کے اس مفہوم کے پیش نظر ہمارا یہ خیال ہے کہ ہر وہ مانع جس سے محرم دوچار ہو اور وہ بیت اللہ تک پہنچنے سے محرم کو روک دے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

"فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" (تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو) کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد بکری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن، قتادہ، عطاء، سدی، علقمہ، ابراہیم، ابوجعفر، شعبہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ سے اس کی روایت ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ آیت میں "قربانی کے جانور" سے مراد آٹھ اقسام ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری (سب کی نر مادہ)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں سب سے اعلیٰ اونٹ کی قربانی ہے، اوسطاً گائے ہے اور ادنیٰ بکری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ محصر اگر خوش حال ہے تو قربانی اونٹ کی کرنی چاہیئے، ورنہ گائے یا بکری کی کرنی چاہیئے۔ شعبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس سے شعائر اللہ کی عظمت ہو وہی افضل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے بکری کے سوا دوسرے قربانی کے جانور مثلاً اونٹ، گائے مراد ہیں۔ یہ قول ابن عمر، عائشہ رضی اللہ عنہا، مجاہد، طاؤس اور عروہ رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آیت کے الفاظ "جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو" سے مراد اونٹ اور گائے ہی میں سے انتخاب ہے کہ جو بھی میسر آجائے ذبح کرلے۔

میرے نزدیک راجح قول پہلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری سہولت اور آسانی پر چھوڑا ہے۔ اس لئے کسی چیز کو ہم اپنی طرف سے خارج نہیں کرسکتے۔ اور بکری بھی قربانی کا جانور ہے۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، لیکن اس پورا کرنے میں اگر کوئی چیز مانع بن جائے، مثلاً مریض ہو جاؤ، کوئی عضو ٹوٹ جائے یا دشمن کا خوف ہو، اور تم ان اعذار کی وجہ سے احرام کھولنا چاہو تو اس کی تمھیں اجازت ہے، تمھیں اس صورت میں جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کر کے احرام کھول لو۔

"وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ" اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے اپنے سر نہ منڈاؤ، یعنی اگر تمھیں رکنا پڑ جائے اور تم احرام کھولنا چاہو تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کردو، البتہ جب قربانی کا جانور اپنے مقام پر پہنچے اور متعینہ تاریخ میں اس کی وہاں قربانی ہو جائے پھر احرام کھولو۔ احرام کھولنے کی تعبیر "سر منڈانے" سے کی ہے، کیونکہ یہی وہ آخری عمل ہے جس کے ذریعہ محرم حلال ہوتا ہے "محل ھدی" (قربانی کے جانور کا مقام) کیا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "محصر کی قربانی کا مقام، کہ جہاں قربانی کے پہنچنے سے پہلے وہ احرام نہیں کھول سکتا، اور اسے سر منڈانے کی اسی وقت اجازت ہے جب اس کی قربانی وہاں پہنچ جائے، مختلف صورتوں میں مختلف ہیں، اگر دشمن کے خطرے کی وجہ سے اسے رکنا پڑا ہے، اور

دشمن ہی قربانی کو اس کی اصل جگہ ذبح کرنے سے مانع بنا ہے تو حرم سے باہر یا حرم کے اندر جہاں بھی اسے روک دیا گیا ہے وہیں اپنی قربانی ذبح کرے اور حلال ہو جائے، لیکن اگر رکاوٹ دشمن نے نہیں ڈالی ہے (بلکہ مرض وغیرہ کی وجہ سے اعمالِ حج کرنے سے معذور و مجبور رہے) تو جب تک بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی نہ کرے گا حلال نہیں ہو سکتا۔ یہ ان حضرات کا قول ہے جنھوں نے کہا تھا کہ آیت "اُحْصِرْتُمْ" میں "احصار" سے مراد صرف دشمن کا رکاوٹ بننا ہے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آں حضورؐ اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں ہی احرام کھول دیا تھا، پھر آپ حضرات نے قربانی کی اور سر منڈوالیے اور بیت اللہ کے طواف اور قربانی کے جانور کے اپنے مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی ہر چیز سے حلال ہو گئے۔ اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے بعد آں حضورؐ نے اپنے کسی صحابی کو جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے کسی چیز کے بھی قضا یا اسے دوبارہ ادا کرنے کا حکم دیا ہو۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فتنہ کے زمانہ میں عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لیے نکلے، اور فرمایا کہ اگر مجھے بیت اللہ جانے سے روکا گیا تو ہم بھی وہی کریں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے عمرہ کا احرام باندھا، کیونکہ صلح حدیبیہ کے سال حضور اکرمؐ نے بھی عمرہ ہی کا احرام باندھا تھا۔ پھر ابن عمرؓ نے اپنے معاملہ پر غور کیا اور فرمایا کہ دونوں (حج وعمرہ) کا معاملہ ایک ہی ہے، اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے عمرہ کے ساتھ حج بھی اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔ بیان کیا کہ پھر آپ نے ایک طواف کیا، آپ کا خیال تھا کہ یہی (دونوں کے لیے) کافی ہے، اور قربانی کی۔ اس روایت کے راوی ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص دشمن کے ذریعہ روک دیا گیا ہو تو اس کا مسئلہ ہمارے نزدیک بھی یہی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو روکا گیا تھا۔ لیکن اگر کسی کو دشمن نے نہیں روکا، بلکہ وہ کسی اور مجبوری کی وجہ سے بیت اللہ تک نہ پہنچ سکا تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے حلال ہو جائے گا، اسے جہاں روکا گیا ہے وہیں سر منڈا لینا اور اپنی قربانی کا جانور ذبح کر لینا چاہیے، اس پر اس حج کی قضا بھی واجب نہیں، البتہ اگر اس نے کبھی اس سے پہلے حج ہی نہیں کیا تھا تو اس پر فرض حج باقی رہے گا۔

ابن خرابہ مخزومی حج کے ارادہ سے نکلے اور راستے میں مرگی آ گئی تو ان کے متعلق عبداللہ بن عمر، مروان بن حکم اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے فتویٰ دیا کہ امورِ حج میں جو اعمال ناگزیر ہیں ان سے ابتداء کریں اور فدیہ دیں۔ پھر اپنے حج کے اس احرام کو عمرہ میں تبدیل کر لیں۔ البتہ اگلے سال پھر حج کریں اور اس میں قربانی کریں۔ ابن وہب بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ہمارے نزدیک یہی اس شخص کا حکم ہے جسے دشمن کے خطرہ کے سوا کسی اور عذر کی وجہ سے رکنا پڑا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بھی شخص اگر احرام باندھنے کے بعد مرض یا کسی اور عذر کی وجہ سے رک گیا، یا چاند کا معاملہ اس پر صاف نہ ہوا تو وہ "محصر" ہے اس کے لیے بھی وہ امور ضروری ہیں جو محصر کے لیے ضروری ہیں، یعنی طواف اور صفا و مروہ کے درمیان آمد و رفت سے پہلے احرام نہ کھولے۔ پھر اگلے سال حج کرے اور قربانی کرے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول بیان کیا گیا کہ احرام باندھنے کے بعد اگر رکاوٹ دشمن نے ڈالی ہے

تو آیت میں "محل ھدی" (قربانی کا مقام) یہ ہے کہ جہاں اسے روکا گیا ہے وہیں قربانی ذبح کر دے۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ملتی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر قربانی کے جانور وادی ثنیہ کے پہاڑ کی پشت پر تھے تو مشرکین نے مزاحمت کی اور آں حضورؐ کو بیت اللہ سے روکا۔ بیان کیا کہ پھر آں حضورؐ نے وہیں قربانی کی جہاں آپ کو روکا گیا تھا، یعنی مقام حدیبیہ میں۔ اور آپؐ نے اپنا سر منڈایا۔ بہت سے صحابہؓ نے آپ کی پیروی کی، اور جب آں حضورؐ کو سر کے بال منڈاتے دیکھا تو اپنے سر کے بال بھی منڈالیے لیکن بعض اس امید پر رکے رہے کہ ممکن ہے انھیں بیت اللہ کے طواف کا موقعہ مل جائے۔ پھر آں حضورؐ نے فرمایا، اللہ منڈانے والوں پر رحم کرے۔ عرض کی گئی، یا رسول اللہ! بال چھوٹے کرنے والوں کو بھی اپنی دعا میں شریک فرمالیں۔ آں حضورؐ نے دوبارہ وہی دعا کی، اللہ منڈانے والوں پر رحم کرے۔ عرض کی گئی، یا رسول اللہ! بال چھوٹے کروانے والوں کو بھی دعا میں شریک کرلیں۔ آں حضورؐ نے فرمایا، اور بال چھوٹے کروانے والوں پر بھی (اللہ رحم کرے)۔ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم کی روایت میں یہ تفصیل ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور مشرکین قریش کے درمیان صلح کی دستاویز لکھی۔ اور یہ صلح حدیبیہ کے سال مقام حدیبیہ میں ہوئی تھی۔ تو اپنے صحابہؓ سے آپؐ نے فرمایا کہ اب اٹھو اور اپنی قربانیاں ذبح کرکے سر منڈالو لیکن اللہ گواہ ہے، ان میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا۔ آں حضورؐ نے انھیں تین مرتبہ یہ حکم دیا لیکن جب کوئی بھی نہیں اٹھا تو آپ خود اٹھ گئے اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خیمہ میں جاکر اس معاملہ کا ان سے تذکرہ کیا۔ ام المؤمنین نے عرض کی کہ یا رسول اللہ، آپ خود باہر تشریف لے جائیں اور اپنی قربانی کا اونٹ ذبح کرلیں اور کسی سے ایک لفظ بھی کچھ نہ فرمائیں۔ پھر اپنے حجام کو بلوا کر اپنا سر منڈالیں۔ چناں چہ آں حضور کھڑے ہوئے اور باہر تشریف لائے۔ کسی سے ایک لفظ بھی کچھ نہیں فرمایا اور قربانی وغیرہ کرلی۔ جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو وہ بھی اٹھ گئے اور اپنی قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے لگے۔ پھر آپس ہی میں بعض نے بعض کا سر مونڈا۔ اس وقت اتنی ریل پیل ہوئی کہ خطرہ تھا کہ کوئی زخمی نہ ہو جائے۔ انھیں روایات کی بنیاد پر ان حضرات کا کہنا ہے کہ جب مقام حدیبیہ پر مشرکین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا اور بیت اللہ نہیں جانے دیا تو آں حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے وہیں قربانی کی اور حلال ہو گئے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ حدیبیہ حدود حرم میں داخل نہیں ہے، اس سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ آیت میں "حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ" میں "مقام قربانی" سے مراد یہ ہے کہ اسے ذبح کرکے کھانے اور اس سے نفع حاصل کرنے کے قابل بنادے، گویا یہ لفظ آیت میں محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، یعنی "جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ لگ جائے محرم کو احرام نہ کھولنا چاہیے۔" ایک حدیث میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو کسی نے صدقہ میں گوشت دیا تھا، اب وہ گوشت ان کی ملکیت تھا، وہ جسے چاہے دے سکتی تھیں، ایسا شخص بھی ان کی اجازت سے اسے کھا سکتا تھا جسے صدقہ لینا جائز نہیں۔ چنانچہ جب حضرت بریرہؓ وہی گوشت جو انھیں کسی نے صدقہ کے طور پر دیا تھا آں حضورؐ کے پاس لے کر آئیں تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ "اپنی جگہ پہنچ چکا ہے"، یعنی پہلے یہ صدقہ تھا، لیکن جب مستحق نے اسے وصول کرلیا تو اب وہ صدقہ نہیں رہا، وہ اپنے ٹھکانے لگ چکا ہے اور صدقہ کے طور پر وصول کرنے والا اسے جسے چاہے دے سکتا ہے۔ آں حضورؐ نے اس کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ گوشت بریرہ کے

لیئے صدقہ تھا، اور ہمارے لیئے ھدیہ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ محصر کے لیئے "محل ھدی" (قربانی کی جگہ) حرم ہے، حرم سے باہر اپنی قربانی ذبح کرنے سے وہ احرام سے نہیں نکل سکتا، کیونکہ اس کے لیئے اس کے سوا اور کوئی "محل ھدی" نہیں۔ عمرو بن سعید نخعی کے متعلق روایت ہے کہ آپ عمرہ کا احرام باندھ کر نکلے جب مقام ذات الشقوق پر پہنچے تو بچھو نے ڈس لیا (اور ادائیگی عمرہ دشوار ہوگئی) آپ کے ساتھی راہ دیکھنے لگے کہ کوئی مل جائے تو انکے متعلق مسئلہ پوچھا جائے۔ ان کی ملاقات ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ انھوں نے آپ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنی قربانی کا جانور وہ (حرم میں) بھیج دیں، اور تم سے طے کرلیں کہ فلاں روز فلاں وقت تم ان کی قربانی ذبح کروگے۔ اور قربانی ذبح ہونے کے اس متعین وقت کے بعد وہ احرام کھول دیں۔ پھر آئندہ ان پر اس عمرہ کی قضا واجب ہے۔ یہی روایت عبدالرحمن بن یزید سے اس طرح منقول ہے کہ ہم عمرہ کا احرام باندھ کر نکلے، ہمارے ساتھ اسود بن یزید بھی تھے۔ جب ہم نے ذات الشقوق پر پڑاؤ کیا تو ہمارے ایک ساتھی کو بچھو نے ڈس لیا۔ وہ اس کی وجہ سے شدید تکلیف و دشواری میں مبتلا ہوگئے۔ ہم بڑی الجھن میں پڑ گئے کہ ان کا کیا کریں؟ ہمارے چند ہم قافلہ راستے پر آئے تو ایک قافلہ آتا ہوا ملا جس میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ہم نے آپ سے عرض کی کہ اے ابو عبدالرحمن! ہمارے ایک ساتھی کو بچھو نے ڈس لیا ہے، ہم ان کا کیا کریں؟۔ فرمایا کہ وہ اب تمھیں اپنی قربانی کے جانور کی قیمت، دے دیں، اور تم ان سے قربانی کیلئے دن اور وقت متعین کرلو، پھر جب ان کی قربانی ذبح ہوجائے تو وہ احرام کھول لیں اور ان پر آئندہ عمرہ کی قضا ضروری ہے۔ یہ روایت مختلف واسطوں سے منقول ہے۔ عمارہ بن عمیر اپنی روایت میں بیان کرتے ہیں کہ اس پر اعتماد کے لیئے یہی کافی ہے کہ عبدالرحمن بن یزید رحمۃ اللہ علیہ اسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ اگر کسی شخص نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا اور پھر وہ شدید مرض یا کسی ایسے عذر کی وجہ سے، جو بیت اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بن گیا، رک گیا تو اسے جو بھی قربانی کا جانور میسر آئے ذبح کردینا چاہیئے، خواہ وہ بکری ہو یا اس سے بڑا قربانی کا کوئی جانور۔ یہ جانور اس کی طرف سے ذبح کیا جائے گا اور اگر یہ حج اس کا پہلا تھا تو آئندہ اس فریضہ کی ادائیگی اسے کرنی چاہیئے، لیکن اگر نفلی حج یا عمرہ تھا تو اس کی قضا واجب نہیں۔ پھر اگر اس نے حج کا احرام باندھا تھا تو اس کی قربانی کا مقام دسویں ذی الحجہ ہے، اور اگر عمرہ کا احرام تھا تو اس کی قربانی کا مقام یہ ہے کہ جب بیت اللہ پہونچے تو قربانی کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آیت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر کسی محرم کو رک جانا پڑا تو اسے اپنی قربانی کا جانور بھیج دینا چاہیئے، جب وہ جانور اس کی طرف سے ذبح کردیا جائے تو احرام کھول دے، قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے اسے احرام نہ کھولنا چاہیئے۔ مذکورہ بالا قول عطاء اور سدی سے بھی منقول ہے۔

جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ قربانی کا مقام حرم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ھدی (قربانی کا وہ جانور جو خانہ کعبہ کے لیئے مخصوص ہو) اور اونٹوں کے ذکر میں فرمایا کہ "وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ" (اور جو کوئی دین خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا تو یہ دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔ تمہارے لیئے ان سے فوائد حاصل کرنا (جائز ہیں) ایک مدت متعین تک، پھر اس کے ذبح کا موقعہ بیت عتیق ..... کے قریب ہے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہدی (قربانی کا وہ جانور

جو خانہ کعبہ کے لئے بھیجا جائے اکا مقام حرم ہی بتایا ہے، اس لیے حرم کے سوا اس کا کہیں اور ذبح کرنا درست نہیں ہوگا۔ جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح حدیبیہ کے موقع پر طرز عمل کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں روایتوں سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ آں حضورؐ کے قربانی کے جانور حدود حرم ہی میں ذبح ہوئے تھے۔ ناجیہ بن جندب اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب (صلح حدیبیہ کے موقع پر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ جانے سے روکا گیا تو میں نے حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ! قربانی کے جانور آپ میرے ساتھ کر دیں، تاکہ ہم اسے حرم کے اندر ذبح کر آئیں۔ آں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تم کس طرح کر سکو گے؟ میں نے عرض کی کہ میں اسے ایسے راستوں سے لے جاؤں گا کہ مشرکین روک نہیں سکیں گے۔ چنانچہ میں نے حرم کے حدود میں لاکر قربانی کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آں حضورؐ نے قربانی حدود حرم میں کی تھی۔

بعض مفسرین نے ان دونوں تفسیروں سے ایک الگ راہ آیت کی تفسیر کی نکالی ہے۔ ان کے خیال میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اے مسلمانو! اگر تمھیں حج کی ادائیگی سے روک دیا گیا، اور خواہ مرض کے نتیجہ میں یا دشمن کے خوف کے نتیجہ میں، تم اعمال حج ادا کرنے پر قادر نہ رہے اور میدان عرفہ میں قیام بھی چھوٹ گیا تو تمہارا جو حج چھوٹ گیا ہے اس کے بجائے جو قربانی بھی تمھیں میسر ہو اسے پیش کر دو اور آئندہ چھوٹے ہوئے حج کی قضا کر لو۔" ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جو شخص حج کی ادائیگی، مرض یا کسی بھی عذر کی وجہ سے، نہ کر سکا اس کے لئے احرام کھولنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان قاعدہ کے مطابق آمد و رفت (سعی) نہ کرلے، لیکن اگر اس میں مقامات حج پر حاضری کی طاقت ہے تو وہ محصر نہیں کہلائے گا، بلکہ اسے حج کرنا ہوگا۔ عمرہ کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس میں "احصار" کی کوئی صورت نہیں، اس کا احرام اگر کسی نے باندھا ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد ہی حلال ہوگا، کیونکہ اس کا کوئی متعین وقت نہیں ہے، ہر وقت ہی کیا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عمرہ کا احرام باندھنے والا آیت کے مفہوم میں داخل نہیں ہے، آیت میں مسئلہ صرف حج کا بیان ہوا ہے۔

آیت کی تفسیر میں اس حد تک تو مفسرین کی اس جماعت کا اتفاق ہے، لیکن اس کے بعد کی تفصیلات میں انھیں حضرات کے اقوال پھر مختلف ہو گئے ہیں۔ ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ جس طرح مرض کی صورت میں "احصار" کا مفہوم نہیں پایا جاتا، یعنی مریض اگر مقامات حج پر حاضری کی قدرت نہیں رکھتا تو اس وقت تک احرام کھولنا اس کے لئے جائز نہیں جب تک وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی نہ کرلے، اسی طرح اب دشمن کی رکاوٹ ڈالنے (احصار) کی صورت بھی باقی نہیں ہے۔ ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ قول نقل ہے۔

دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ دشمن کا بیت اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بننا (احصار) آج بھی موجود ہے اور اس کی صورت جس طرح پہلے ممکن تھی اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں حج سے روک دیا جائے، یہاں تک کہ حج چھوٹ جائے تو تم وہ قربانی کا جانور پیش کر دو جو تمھیں میسر ہو۔ سالم بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حج کے سلسلے میں اس طرح کی قید لگانا پسند نہیں کرتے تھے، آپ فرماتے کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کافی ہے کہ اگر کسی کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا جائے تو بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرلے اور پھر ہر چیز سے حلال ہو جائے۔ اس کے بعد دوسرے سال حج کرے اور قربانی کرے، لیکن اگر قربانی نہ میسر آئے تو اس کے بجائے روزے رکھ لے۔ ایک روایت نافع کی ابن عمر

رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی ہے۔ آپ کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات گذرتے ہوئے، ابن خرابہ سے ہوئی، وہ اس وقت مقام سقیا میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ان کا کوئی عضو ٹوٹ گیا ہے۔ انھوں نے آپ سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا، کیونکہ حج کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے احرام نہ کھولیں، ہاں اگر تکلیف ہے تو دوا کر سکتے ہیں۔ اور جو قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کر دیں۔

سالم بن عبداللہ کی ایک روایت میں آپ سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا، حج کا احرام باندھنے کے بعد اگر کسی شخص کو خوف، مرض یا اسی طرح کے کسی اور عذر کی وجہ سے رک جانا پڑا تو علاج معالجہ میں ہر وہ چیز وہ استعمال کر سکتا ہے جو ضروری ہو، صرف عورت اور خوشبو اس کے لیے حلال نہیں ہوگی جس فدیہ کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے، یعنی روزہ یا صدقہ یا قربانی، اسے ادا کرے۔ پھر اگر اسی حالت میں اس کا حج چھوٹ گیا، یا مزدلفہ کی فجر سے پہلے میدانِ عرفہ کا قیام چھوٹ گیا جب بھی اس کا حج چھوٹ جاتا ہے، تو یہ حج عمرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، اب اسے مکہ معظمہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرنی چاہیئے، اگر ساتھ میں قربانی کا جانور ہے تو مکہ میں مسجد حرام کے قریب اسے ذبح کرنا چاہیئے، پھر اپنا سر منڈ لے یا بال چھوٹے کرلے۔ اس کے بعد عورت، خوشبو اور دوسری چیزیں اس کے لیے حلال ہو جاتی ہیں۔ آئندہ اسے اس چھوٹے ہوئے حج کی قضا کرنی پڑے گی اور جو جانور آسانی سے مل سکے اس کی قربانی کرنی ہوگی۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول یہ روایتیں اس صورت سے متعلق تھیں جب محرم مرض یا اسی طرح کے کسی اور عذر کی وجہ سے حج نہ کر سکا ہو۔ لیکن اگر دشمن نے بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا ہو تو اس سلسلے میں آپ کا بھی وہی مسلک ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہم اس سے پہلے نقل کر آئے ہیں۔

نافع رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جس سال حجاج نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف فوج کشی کی تھی اس سال ابن عمر رضی اللہ عنہ حج کے ارادے سے نکلے۔ آپ کے دو صاحبزادے سالم اور عبیداللہ نے آپ سے عرض کی، اگر آپ اس سال حج نہ کریں تو بھی کوئی حرج نہیں، ہمیں خطرہ ہے کہ اس سال جنگ ہوگی اور آپ بیت اللہ تک پہنچ نہیں سکیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر مجھے بیت اللہ تک جانے نہ دیا گیا تو میں بھی وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کیا تھا جب آپ کو کفارِ قریش نے روکا تھا۔ آں حضور نے سر منڈایا تھا اور احرام کھول کر، واپس آگئے تھے۔

عمرہ کے متعلق جو ان حضرات کے حوالہ سے ہم یہ نقل کر آئے ہیں کہ اس میں "احصار" کی کوئی صورت ہی نہیں، تو اس سلسلے میں ابو العلاء بن شخیر سے روایت ہے کہ میں عمرہ کا احرام باندھ کر نکلا، راستے میں اپنی سواری سے گر پڑا اور میرا پاؤں ٹوٹ گیا۔ پھر میں نے ابنِ عباس اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں اس سے متعلق مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا تو آپ حضرات نے فرمایا کہ عمرہ کا کوئی متعین وقت نہیں ہوتا، اس لیے جب تک بیت اللہ کا طواف نہ کر لو احرام نہ کھولو۔ بیان کیا کہ پھر میں مقام وثنیہ یا اس کے قریب سات یا آٹھ مہینے تک (صحت کے انتظار میں) ٹھہرا رہا اور پھر کہیں جا کے عمرہ ادا کیا)۔ آپ حضرات سے اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں۔ ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہے، آپ نے

فرمایا کہ ایسی صورت میں اس وقت تک احرام نہ کھولنا چاہیئے جب تک بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی نہ کرلے، پھر سر منڈائے یا بال چھوٹے کروائے (حلال ہونے کے لیئے) اور اس صورت میں اس پر کسی چیز کی قضا وغیرہ واجب نہیں۔

ان تمام اقوال میں راجح قول یہ ہے کہ آیت "پس اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو اسے پیش کردو) اور اس وقت تک سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ جائے" میں ہر "محصر" کا حکم بیان ہوا ہے، خواہ اس نے عمرہ کا احرام باندھا ہو یا حج کا، اور اس کی "قربانی کا مقام اسی جگہ کو قرار دیا ہے جہاں اسے روکا گیا ہے، قربانی کے "محل" سے مراد "جائے ذبح و قربانی" ہے، قربانی اپنے مقام پر پہنچ جائے، یعنی ذبح ہو جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آپ کو بیت اللہ سے روکا گیا تھا تو آپ اور آپ کے صحابہؓ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، آں حضورؐ نے بھی قربانی کی اور آپؐ کے صحابہؓ نے بھی آپؐ کے حکم سے قربانی کی، اور بیت اللہ پہنچے بغیر احرام کھول دیا، پھر اس کی قضا دوسرے سال کی۔ آج تک سیرتِ نبویؐ کے کسی جاننے والے نے اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ آں حضورؐ یا آپؐ کے کسی صحابیؓ نے احرام کھولنے کے بجائے اس کا انتظار کیا ہو کہ رکاوٹ دور ہو اور پھر حرم پہنچ کر بیت اللہ کے طواف اور سعی کے بعد احرام کھولا جائے۔ اس لیے خصوصاً جبکہ کوئی حدیث یا کوئی دوسری دلیل اس کے خلاف بھی نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی اتباع ہی صحیح ہوگی۔ اہلِ علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی تھی جب مشرکین نے حضور اکرمؐ کو حدیبیہ میں بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا تھا۔ پھر جب کہ آں حضورؐ کی احادیث سے بھی یہی ثابت ہے تو اس کے خلاف کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مولا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ جس شخص کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے (احرام باندھنے کے بعد) تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج واجب ہے۔ عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ابو ہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی تو ان حضرات نے اس کی تصدیق کی۔ اس حدیث کو حضور اکرمؐ کے اس عمل کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے کہ جب مشرکین نے صلح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کو بیت اللہ کے داخلہ سے روکا، حالانکہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، تو آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے اس وقت احرام کھول دیا تھا اور پھر دوسرے سال اس کی قضا کی تھی۔

"فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ"

(لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے فدیہ دے)۔ یعنی مُحرِم اگر بیماری یا سر کے پھوڑے یا اس جیسی کسی اور تکلیف کی وجہ سے سر منڈانے پر مجبور ہے تو اس اچانک مجبوری کی وجہ سے وہ قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے سر منڈا سکتا ہے، البتہ اس قبل از وقت سر منڈانے کی وجہ سے اس پر فدیہ واجب ہوگا، یعنی اس کے بدلہ میں یا اسے روزے رکھنے ہوں گے یا خیرات کرنی ہوگی یا قربانی کرنی ہوگی۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "سر کی تکلیف" سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مراد سر میں جوئیں وغیرہ پڑجانا ہے، یا سر کا درد ہو جائے (جس میں سر منڈانا ضروری ہو)

اور اسی طرح کی دوسری سر کی تکالیف۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر سر منڈانے کا فدیہ قربانی یا خیرات کی صورت میں دینا ہے تو فدیہ دینے سے پہلے سر نہ منڈائے، البتہ اگر فدیہ میں روزے رکھنا ہے تو فدیہ سے پہلے سر منڈا سکتا ہے، پھر بعد میں روزے رکھے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ علقمہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے مخالف قول نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ احرام باندھنے کے بعد اگر بیت اللہ سے کسی کو روک دیا گیا تو بکری وغیرہ کی جو بھی قربانی اسے میسر ہو اسے بھیج دے، لیکن اگر قربانی کے اپنے مقام پر پہنچنے سے پہلے اس نے جلدی کی اور اپنا سر منڈا لیا، خوشبو لگالی یا کوئی اور دوا اسی طرح کی استعمال کرلی تو اس پر روزے، خیرات یا قربانی کا فدیہ واجب ہوگا۔ ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ قول سعید بن جبیر کے سامنے بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی کہتے تھے۔ یہ قول مجاہد اور قتادہ کے علاوہ ابن عمر اور علی رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جن فدیوں کا ذکر آیت میں ہوا ہے وہ سر منڈانے سے پہلے ادا کرنے ہوں گے، یعنی اگر قبل از وقت سر منڈانے کا ارادہ ہے تو پہلے مذکورہ فدیوں میں سے کوئی ادا کرلے پھر سر منڈائے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اس کی دلیل میں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی جاتی ہے (حج کے موقعہ پر) آپ کا گذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا، ان کے سر میں جوئیں اور ان کے انڈے بچے بہت زیادہ پیدا ہو گئے تھے، حضور اکرم ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا، تمہارے پاس ایک بکری ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو آں حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر تم چھ مسکینوں کو کھانا کھلادو یا تین روز کے روزے رکھ لو، اور اپنا سر منڈا لو۔

بیماری کی جن صورتوں میں شریعت نے جسم پر دوا استعمال کرنے یا سر منڈانے کی اجازت دی ہے اس میں وہ تمام بیماریاں شامل ہیں جن میں سر منڈانا بھی علاج کا جز ہے، جیسے سرسام جس میں سر منڈا دینے سے افاقہ ہوجاتا ہے، یا اسی طرح کی اور بیماریاں۔ اسی طرح وہ زخم جو جسم پر ہوجائیں اور علاج کے لیے ان پر دوا یا خوشبو لگانی پڑے۔ اس میں پھوڑے اور دوسری جلدی بیماریاں بھی آجاتی ہیں۔ تکلیف (اذیٰ) جو سر میں ہوتی ہے اور جس میں بال منڈانے کی اجازت ہے اس میں سر کا درد، جوؤں کی کثرت اور سر کی ہر وہ تکلیف جس کا علاج سر منڈانا ہو، یا اس سے وقتی تکلیف دور ہوجاتی ہو، تو یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد "اَوْبِہٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِہٖ" کے عموم میں داخل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ یہ حدیث ثابت ہے کہ یہ آیت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، صلح حدیبیہ کے موقع پر انھیں ان کے سر میں جوؤں کی کثرت کی وجہ سے تکلیف تھی۔ خود کعب ابن عجرہ کی روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب سب حضرات عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گذرے، میرے کانوں تک لٹکے ہوئے بالوں میں جوئیں بھری پڑی تھیں، حال یہ تھا کہ جڑ سے نوک تک ایک ایک بال میں جوئیں اور ان کے بچے لپٹے ہوئے تھے، آں حضور ﷺ نے فرمایا، اس سے تو بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی؟ میں نے عرض کی، ہاں، یارسول اللہ! بہت زیادہ! آپ ﷺ نے دریافت فرمایا، تمہارے پاس کوئی قربانی کے قابل جانور ہے؟ میں نے عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا کہ اگر چاہو تو تین دن کے روزے رکھ لو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو چھ مسکینوں کو، ہر مسکین نصف صاع کے حساب سے، تین صاع کھجور صدقہ کردو۔ ایک دوسری روایت، جو

عبداللہ بن معقل، کعب رضی اللہ عنہ کے واسطے سے، بیان کرتے ہیں، میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مذکورہ بالا آیت میری ہی بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فدیہ سر منڈانے کے بعد واجب ہوتا ہے، یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اگر محرم کو قبل از وقت سر منڈانا ہے تو اسے پہلے فدیہ دینا ہوگا۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ آں حضورؐ نے انھیں سر منڈانے کے حکم کے بعد فدیہ کا حکم دیا تھا۔ عبداللہ بن معقل بیان کرتے ہیں کہ کعب رضی اللہ عنہ مسجد میں تھے، میں بھی ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے آپ سے مذکورہ بالا آیت کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے ہی متعلق نازل ہوئی تھی، میرے سر میں تکلیف تھی، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو جوئیں میرے سر سے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آں حضورؐ نے مجھے دیکھکر فرمایا، میرا خیال یہ نہیں تھا کہ تمھیں اس درجہ تکلیف ہوگی، تمہارے پاس کوئی بکری بھی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو یہ آیت نازل ہوئی، اگرچہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی، لیکن اس کا حکم عام ہے۔ عبداللہ بن معقل ہی کی ایک روایت میں ہو کہ کعبؓ نے فرمایا، حضور اکرمؐ نے جب میری تکلیف دیکھی تو فرمایا کہ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ تمھیں اس درجہ تکلیف ہوگی، پھر آپؐ نے حجام کو بلایا۔ اس نے میرا سر مونڈ دیا۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا، تمہارے پاس قربانی کے لئے کوئی بکری ہوگی؟ میں نے عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا، پھر تین دن تک روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو، ہر مسکین نصف صاع کے حساب سے، کھانا کھلاؤ۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی روایت میں ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنا سر منڈالو، اور تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ یا ایک بکری ذبح کرو۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی یہ روایت مختلف واسطوں سے منقول ہے

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت حدیبیہ میں درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے بھی احرام باندھ رکھا تھا۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی روایت کرنے والوں میں محمد بن کعب، ابو وائل شقیق بن سلمہ اور دوسرے حضرات ہیں۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بھی کعب رضی اللہ کی اس حدیث کی روایت کی ہے۔

فدیہ کا مفہوم ہم بیان کر چکے ہیں کہ "بدلہ، جزاء" کے معنیٰ میں ہے۔ صدقہ کی مقدار اور روزوں کی تعداد کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جو محرم پر قبل از وقت سر منڈانے کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس صورت میں تین روزے یا تین صاع[1] کا صدقہ چھ مسکینوں پر، فی مسکین نصف صاع کے حساب سے، واجب ہوگا۔ اس سے پہلے جو روایتیں ہم نے بیان کی ہیں ان میں بعض روایتوں میں بصراحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صدقہ کی یہی مقدار اور روزوں کی اتنی ہی تعداد منقول ہے، اور یہ حضرات ان احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قول ابو مالک، عطاء، مجاہد، ابراہیم، سدّی، ربیع سعید بن جبیر، علقمہ اور محمد بن کعب رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ کعب بن عجرہ اور علی رضی اللہ عنہما نے بھی فدیہ کی یہی مقدار بیان کی ہے۔ ان تمام حضرات سے اس مضمون کی روایتیں نقل ہیں کہ قبل از وقت سر منڈانے

---

[1] ایک "صاع" اسی روپے کے سیر سے ساڑھے تین سیر کے مساوی ہے (مترجم)

پر ایک بکری کی قربانی یا تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کو تین صاع غلّے کی خیرات واجب ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کوئی محرم سر کی تکلیف میں سر منڈاتا ہے، دوا یا خوشبو کا استعمال کرتا یا کوئی بھی ایسا عمل کرتا ہے جو احرام کی حالت میں، جب کہ اسے کوئی بیماری یا تکلیف وغیرہ نہ ہو، کرنا جائز نہیں، تو اس پر دس دنوں کے روزے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے۔ یہ روایت حسن اور عکرمہ رحمہما اللہ سے منقول ہے۔ ان حضرات نے اس مسئلہ کو قیاس کے ذریعہ حل کیا ہے۔ یعنی اگر کوئی محرم قربانی نہ کرسکے تو اس پر دس دن کے روزے فرض ہیں، گویا شریعت کی نظر میں ایک قربانی کا بدل دس دن کے روزے ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد مسکین کو کھانا کھلانے کا نمبر ہے، اگر کوئی شخص روزے نہ رکھ سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ نے ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلانا ضروری قرار دیا ہے، اس لیے دس روزوں کا بدل دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ قبل از وقت سر منڈانے کی صورت میں بھی ابتداءً ایک قربانی ہی واجب ہے، اور اسی لیے ان حضرات نے اس پر روزہ اور صدقہ کو قیاس کیا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قبل از وقت سر منڈانے والے محرم پر واجب ایک بکری کی قربانی ہی ہے، لیکن اگر بکری اسے میسر نہ ہو تو ایک بکری کی قیمت درہموں (کرنسی) میں لگائی جائے، اور ان دراہم کا جتنا غلّہ ملتا ہو اتنے ہی غلہ کا صدقہ کیا جائے۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو پھر ہر آدھے صاع غلّے کے بدلہ میں ایک روزہ رکھے۔ سعید بن جبیر اور علقمہ رحمہما اللہ سے یہ روایت ہے، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں یہ قول نقل ہوا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان تینوں صورتوں کے درمیان اسے اختیار ہے جس طرح سے چاہے فدیہ دے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جتنی چیزیں بھی لفظ "اَوْ" (یا) کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں ان میں اختیار دیا گیا ہے کہ مذکورہ امور میں جو چاہے اختیار کرے، اس کے خلاف جن چیزوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر فلاں نہ ملے تو پھر فلاں اختیار کرے، تو اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس کا سب سے پہلے بیان ہوا اسے ہی کرنا ہے، البتہ وہ اگر نہ ملے تو اس کے بعد بیان شدہ کو لینا ہے، وعلیٰ ھٰذا القیاس۔ زیر بحث قول عمرو بن دینار، عکرمہ، عطاء اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔

ان تمام اقوال میں ہمارے نزدیک صحیح وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر ثابت ہے، کہ آپؐ نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو سر منڈانے کی اجازت دی اور ان سے فرمایا کہ اس قبل از وقت سر منڈانے کے بدلے میں وہ فدیہ دیں، چاہے ..... فدیہ بکری کی قربانی کی صورت میں ہو، یا تین دن کے روزے رکھ کر یا چھ مسکینوں کو تین صاع غلّہ، ہر مسکین کو آدھا صاع کے حساب سے، صدقہ کرکے۔ فدیہ دینے والے کو اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جس کا چاہے فدیہ دے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی ایک کا پابند نہیں کیا ہے۔ البتہ ان تینوں سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ فدیہ انھیں میں سے کسی ایک کا دینا ہوگا۔ قسم کے کفارہ دینے کی بھی صورت اسی طرح بیان ہوئی ہے اور اس صورت میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ کفارہ قسم میں بیان شدہ تین چیزوں میں سے کسی ایک کا کفارہ دینا ہوگا صورت زیر بحث کو اس پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، کیونکہ دونوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فدیہ دینا ہوگا؛ اور اس کے بعد سر منڈانے کی اجازت ہے، ان کے سامنے بھی اس مسئلہ کی نظائر میں اجماع امت کو رکھا جائے گا، امت کا اتفاق ہے کہ قسم کا کفارہ بعد میں ہوتا ہے۔ یہی صورت تمتع کے کفارہ میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان نظائر کو چھوڑ کر اس خاص مسئلہ میں یہ انفرادیت کس بنیاد پر پیدا کی جا سکتی ہے کہ اس کا فدیہ محرم پر سر منڈانے

سے پہلے ہی واجب ہو جائے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فدیہ میں اگر ایک بکری کی قربانی نہ کر سکا تو دس دن کے روزے رکھنے ہوں گے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ یہ قول صحیح حدیث کے خلاف ہے، اور اس لیے ناقابل قبول ہے۔ اس کے علاوہ ان کے قیاس کی بنیاد بھی غلط ہے۔

علماء کے اس بارے میں اقوال مختلف ہیں کہ فدیہ کی ادائیگی قربانی یا صدقہ کی صورت میں کہاں ہونی چاہیئے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی مکہ معظمہ ہی میں انجام پانی چاہیئے، کسی اور جگہ کرنے سے اس کی ادائیگی نہیں ہوگی، یہ قول حسن، طاؤس، عطاء، اور مجاہد رحمہم اللہ سے نقل ہے، یعنی قربانی یا صدقہ کی صورت میں اگر فدیہ دینا ہے تو پھر وہ صرف مکہ ہی میں دینا ہوگا، مکہ کے سوا کسی اور جگہ ان کی ادائیگی حالت احرام میں قبل از وقت سر منڈا لینے کے فدیہ کے طور پر نہیں ہوگی۔ البتہ روزے کی صورت میں فدیہ کی ادائیگی کسی جگہ بھی کی جا سکتی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بحالت احرام قبل از وقت کسی عذر کی وجہ سے سر منڈا لینے کی صورت میں جو فدیہ قربانی یا صدقہ یا روزے کی صورت میں واجب ہوگا، ان کی ادائیگی کے لیے کسی مخصوص جگہ یا شہر کی قید نہیں، وہ کہیں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ عبداللہ بن جعفر کے مولا ابو اسماء بیان کرتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ حج کے ارادہ سے نکلے، اور آپ کے ساتھ علی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ میں اپنے مولا ابن جعفر کے ساتھ تھا۔ بیان کیا کہ اچانک ہمیں ایک صاحب راستے میں سوئے ہوئے ملے اور ان کی اونٹنی ان کے سر کے پاس تھی۔ ہم نے آواز دی، اے سونے والے!۔ وہ جب بیدار ہوئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابن جعفر نے انھیں اٹھا لیا اور ہم انھیں مقام سقیا پر لے کر آئے۔ پھر علی رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا اور ان کے ساتھ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ بیان کیا کہ پھر ہم نے حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی تقریباً بیس دن تک تیمارداری کی۔ آخر علی رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ تم کس طرح کی تکلیف محسوس کرتے ہو، انھوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے آپ کا سر مونڈ دیا گیا، پھر آپ نے ایک اونٹ منگوایا اور (اس قبل از وقت سر مونڈنے کے فدیہ میں) اس کی قربانی کی (یعنی یہ قربانی مکہ سے باہر ہوئی)۔ یہ روایت متعدد واسطوں سے منقول ہے۔ مجاہد اور ابراہیم رحمہما اللہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے کہ فدیہ جہاں سہولت ہو ادا کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ صرف قربانی مکہ میں کی جائے گی، باقی صدقہ اور روزے جہاں چاہے رکھ سکتا ہے۔ یہ قول عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ میرے نزدیک راجح قول دوسرا ہے، یعنی فدیہ، خواہ وہ کسی صورت میں ادا کیا جائے، .... کی ادائیگی میں کسی بھی خاص شہر یا مقام کی قید نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود کسی شہر یا مقام کی قید نہیں لگائی، بلکہ فدیہ کے حکم کو عموم کے ساتھ بیان کیا ہے، اس لیے ہمیں بھی عام ہی رکھنا ہوگا اور فدیہ دینے والا جہاں بھی قربانی کرے یا صدقہ کرے یا روزے رکھے، اس کا فدیہ ادا ہو جائے گا۔

اس موقعہ پر ایک اور مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ فدیہ اگر قربانی کی صورت میں دیا گیا ہے تو فدیہ دینے والا خود بھی اس قربانی کے گوشت کو کھا سکتا ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ فدیہ دینے والا فدیہ کی قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام گوشت کا صدقہ کر دے۔ عطاء اور مجاہد رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ آپ حضرات سے نقل ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کر لینے کا بدلہ قربانی کی صورت میں، فدیہ کی قربانی اور مسکینوں

کے لیئے کی ہوئی نذر کا کھانا جائز نہیں، بلکہ انھیں صدقہ کر دینا ہوگا، البتہ نفلی قربانی یا تمتع کی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے۔
دوسرا قول یہ ہے کہ فدیہ کی قربانی کا گوشت کھانا جائز ہے۔ یہ قول ابن عمر رضی اللہ عنہ، ابن ابی لیلیٰ حماد اور حسن رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ جن حضرات نے فدیہ کا گوشت فدیہ دینے والے کے لیئے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فدیہ خود اس کے لیئے ہوتا تو اس کا کوئی مفہوم نہیں باقی رہ جاتا کہ اسی پر اس کی ادائیگی واجب ہے، کیونکہ کسی زبان میں یہ محاورہ آپ نہیں بتا سکتے کہ "فلاں شخص پر خود اسی کا قرض چاہیئے" اس لیئے لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ جو فدیہ اس پر واجب ہے وہ اس لیئے واجب ہے تاکہ وہ دوسروں پر اسے خرچ کرے، خود اس کے لیئے اس میں سے کھانا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ فدیہ کی قربانی کا گوشت خود فدیہ دینے والے کے لیئے جائز ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی اس قربانی کے حکم میں ہے جو عید الاضحیٰ میں کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کا تمام گوشت مسکینوں کو دے دینے کا حکم نہیں دیا ہے، اس لیئے جب کوئی شخص مذکورہ بالا صورت میں کسی جانور کو ذبح کرتا ہے تو وہ اللہ کا حکم بجا لاتا ہے، اور اب اسے اس میں سے کھانے کی بھی اجازت ہے اور حسب منشاء صدقہ کرنے کی بھی اجازت ہے، یعنی اگر ادائیگی صدقہ یا روزے کے بجائے قربانی کی صورت میں ہو رہی ہے تو فدیہ اس پر صرف جانور کو ذبح کرنے کا واجب ہے اور ذبح کے بعد فدیہ ادا ہو جاتا ہے، اس پر ذبح کیئے ہوئے جانور کے گوشت کا صدقہ بھی واجب نہیں ہے۔ لیکن اس صورت میں اگر وہ اس قربانی کا تمام گوشت خود استعمال کر لیتا ہے اور اس میں سے ایک بوٹی بھی صدقہ نہیں کرتا تو اس میں کوئی حرج نہ ہونا چاہیئے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی اہل علم اس کا قائل نہیں۔ اب دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ اس میں سے کچھ صدقہ کرنا بھی اس پر واجب ہے، اس صورت میں جس طرح اپنے مال کی زکات کوئی شخص خود نہیں کھا سکتا، اس فدیہ کی قربانی کا گوشت بھی کھانا اس کے لیئے جائز نہیں ہوگا۔ امت کا یہ اجماع اس قول کی تائید کے لیئے واضح دلیل ہے کہ خود فدیہ دینے والے کے لیئے فدیہ کا گوشت کھانا جائز نہیں۔

"نسك" کلام عرب میں اللہ کے لیئے ذبح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ "نسك" سے مراد بکری کا ذبح کرنا ہے۔

"فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ" کی تفسیر بعض مفسرین نے کی ہے کہ "پھر جب تم اس مرض سے شفا پا جاؤ جس نے تمھیں حج اور عمرہ سے روک دیا تھا"۔ علقمہ اور عروہ رحمہما اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "جب تمھیں خوف سے امن ہو جائے"، قتادہ اور ربیع سے یہ تفسیر نقل ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اگر خوف ہے تو اس سے امن ہو جائے، مرض ہے تو اس سے شفا ہو جائے"۔ یہ قول زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ "امن" (جس سے امنتم ماخوذ ہے) خوف کے مقابل اور ضد میں استعمال ہوتا ہے یہ مرض کے مقابل نہیں ہے۔ البتہ اگر مرض ایسا ہے کہ اس میں جان کا بھی خطرہ ہے، پھر اس کے مقابل میں بھی اس کا استعمال ہو سکتا ہے، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ "پھر جب تم مرض کی شدت اور خوف میں ہلاکت سے امن میں ہو جاؤ"۔ لیکن یہ مفہوم پیدا کرنا دور کی کوڑی لانا ہے۔ دشمن کے خوف سے امن اور حالت اطمینان میں ہو جانا یوں بھی زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ آیات صلح حدیبیہ کے موقع پر دشمن سے خوف ہی کی حالت

میں نازل ہوئی تھیں۔

"فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" یعنی اے مسلمانو، جب تمھیں روک دیا جائے تو جو قربانی کا جانور بھی میسر ہو اسے پیش کردو۔ پھر جب تم حالتِ اطمینان میں ہو جاؤ اور تمہارا دشمن کا خوف یا مرض میں ہلاک ہو جانے کا خوف جاتا رہے" اور حج کے ساتھ عمرہ سے بھی مستفید ہونا چاہو تو تم پر لازم ہے کہ جو قربانی تمھیں میسر ہو اسے کر ڈالو"

اس آیت میں تمتع (حج کے ساتھ عمرہ سے بھی مستفید ہونے) کی کون سی صورت بیان ہوئی ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کسی نے حج کا احرام باندھا تھا، لیکن درمیان میں اسے دشمن کے خوف، مرض یا کسی بھی معقول وجہ سے رک جانا پڑا اور اس کا حج چھوٹ گیا، تو رکاوٹ دور ہونے کے بعد اسے مکہ معظمہ حاضر ہونا چاہیئے اور حج کے بجائے صرف عمرہ کرکے اپنا احرام کھول دینا چاہیئے۔ اب وہ محرم نہیں رہا، لیکن پھر آئندہ سال اسے حج کرنا چاہیئے اور قربانی کرنی چاہیئے، کیونکہ سال اول میں اپنے پہلے احرام سے دوسرے سال کے دوسرے احرام تک اسے حلال اور احرام سے آزاد رہنے کا فائدہ حاصل ہوا ہے،.... سال اول میں اس نے عمرہ کیا تھا اور دوسرے سال حج ادا کیا۔ یہ قول ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "اگر تمھیں احرام کے بعد حج سے رک جانا پڑے تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کردو، اب تم حلال ہو، احرام کھولنے کے لیئے تم نے صرف قربانی ذبح کردینی کافی سمجھی، اس کے لیے عمرہ نہیں کیا، بلکہ عمرہ کو دوسرے سال حج کے ساتھ ادا کرنے کے لیئے رکھ چھوڑا۔ اس لیئے جب تمھیں خوف یا مرض سے چھٹکارا ملے تو ایامِ حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھو اور افعالِ عمرہ کی ادائیگی کے بعد یہ احرام کھول دو، پھر جب حج کے دن آئیں تو حج کا احرام باندھو، تو عمرہ اور حج کے درمیان میں احرام کھول کر تم جو مستفید ہوگے اس کی وجہ سے تم پر واجب ہے کہ جو قربانی کا جانور تمھیں میسر ہو اس کی قربانی کرو"۔ یہ قول ابراہیم علقمہ سے نقل کرتے ہیں، آپ نے بیان کیا کہ علقمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول جب میں نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔ علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول روایت ہے، قتادہ اور ابراہیم کا بھی یہی خیال تھا۔ اس قول کی بنیاد پر حج سے کسی مجبوری کی وجہ سے رک جانے والا قربانی کے جانور کے اپنے مقام پر ذبح ہو جانے ہی سے حلال ہو جاتا ہے، لیکن خوف یا مرض کے ختم ہو جانے کے بعد وہ شخص بیت اللہ پہنچ کر عمرہ ادا کرتا ہے تو اس پر دوسرے سال صرف حج واجب ہوگا، اور اگر بیت اللہ نہیں جاتا، بلکہ اس کے بجائے گھر واپس چلا آتا ہے تو آئندہ سال اس پر حج کے ساتھ عمرہ بھی واجب ہوگا اور اس لیئے قربانی بھی کرنی ہوگی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت صرف محصر یعنی ایسے شخص ہی کے بارے میں نہیں ہے جسے احرام باندھنے کے بعد کسی عذر شرعی کی بنا پر حج سے رُک جانا پڑا، بلکہ اس میں عام حکم بیان ہوا ہے اور محصر اور غیر محصر سب کے لیئے ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بجائے یہ قول نقل ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا حکم ہے جنھوں نے پہلے تو صرف حج کا احرام باندھا تھا، لیکن پھر اسے فسخ کرکے عمرہ کا احرام باندھ لیا، اور افعالِ عمرہ ادا کرنے کے بعد ایامِ حج تک حلال رہے، اور جب حج کے دن آئے تو حج کا احرام باندھا۔ ایسے شخص پر تمتع کی قربانی واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ حج کے ارادہ سے نکلے تھے۔ جب مکہ معظمہ پہنچے تو آں حضور نے فرمایا کہ جو کوئی (عمرہ کے افعال کی ادائیگی کے بعد) حلال ہونا چاہے وہ حلال ہو جائے۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ، آپ تو حلال نہیں ہو رہے ہیں؟ آنحضور

نے فرمایا کہ میں اپنے ساتھ قربانی کا جانور لایا ہوں، اس لیے میں حج قران کروں گا)

ایک اور قول یہ ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا حکم بیان کیا گیا ہے جو ایام حج میں مکہ معظمہ کے سوا کسی دوسرے شہر سے عمرہ کا احرام باندھ کر آئیں، کہ افعالِ عمرہ کی ادائیگی کے بعد انھیں حلال ہو کر مکہ معظمہ ہی میں ٹھہر جانا ہے۔ پھر جب حج کی ادائیگی کے دن آئیں تو حج کا احرام باندھ کر حج ادا کرنا ہے، یہی عمرہ کے احرام سے حلال ہو کر حج کے احرام تک اس سے مستفید ہونا ہے اور اس پر حسبِ استطاعت قربانی واجب ہے۔ یہ قول ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، مجاہد، عطاء، ابن ابی لیلیٰ، سعید بن مسیب رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ عطاء سے ایک روایت میں ہے کہ تمتع اللہ کی تمام مخلوق کے لیے جائز ہے، آزاد، غلام، مرد، عورت، ہر انسان کے لیے ایام حج میں عمرہ کرنے کے بعد مکہ معظمہ ہی میں قیام کی اجازت ہے، تاکہ حج کے دن آئیں تو حج کا احرام باندھ کر حج کی بھی ادائیگی کرے۔ لہٰذا "تمتع" اس لیے کہتے ہیں کہ عمرہ اس میں حج کے مہینوں ہی میں کیا جاتا ہے، اور پھر عمرہ سے فراغت کے بعد حج کے احرام تک انسان احرام سے آزاد رہنے کا فائدہ (تمتع) حاصل کرتا ہے۔

میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ آیت میں محصر (حج سے روک دیئے جانے والے) ہی کا حکم بیان ہوا ہے، یعنی جب تم حالت اطمینان میں ہو جاؤ تو جو شخص "احصار" کی وجہ سے حج چھوڑنے پر مجبور رہا تھا، اگر وہ پچھلے سال حج کے چھوٹ جانے کی وجہ سے آئندہ سال حج کے ساتھ عمرہ سے بھی مستفید ہو، یعنی حج کے مہینوں میں حج کے احرام سے پہلے عمرہ کا احرام باندھے، اور پھر اس کی ادائیگی کے بعد حج کے احرام تک حلال ہونے کا فائدہ اٹھائے تو اس پر لازم ہے کہ جو قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کرے۔ اس قول کے راجح ہونے کی وجہ ہے کہ ذکر آیت میں محصر ہی کا ہو رہا ہے۔

"فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ" بیان یہ ہو رہا تھا کہ حج تمتع میں جو بھی قربانی میسر ہو وہ پیش کرنی ہوگی۔ اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ "لیکن اگر کسی کو قربانی کا جانور میسر ہی نہ آئے تو وہ تین روزے زمانۂ حج میں رکھے، اور سات روزے اپنے گھر واپس ہو کر" بعض حضرات کہتے ہیں کہ زمانۂ حج کے یہ تین روزے عرفہ میں قیام کے دن تک کسی بھی وقت رکھے جا سکتے ہیں، صرف یہ ضروری ہے کہ آخری روزہ عرفہ کے دن تک پورا ہو جائے۔ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پہلا روزہ یوم ترویہ (ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ) سے ایک دن پہلے رکھ لے، دوسرا یوم ترویہ میں اور تیسرا عرفہ (ذی الحجہ کی نویں تاریخ) میں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حج تمتع کرنے والا عمرہ کے احرام کے بعد عرفہ کے دن تک کسی بھی دنوں میں روزے رکھ سکتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی، علی رضی اللہ عنہ سے منقول روایت کے مطابق قول نقل ہوا ہے۔ مذکورہ بالا قول عروہ، حسن، حکم، ابراہیم، سعید بن جبیر، عطاء، مجاھد، عطاء بن ابی رباح، عامر، سدی، ربیع، طاؤس اور ابو جعفر سے نقل ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ روزے رکھنا تو چاہیئے عرفہ کے دن تک ہی، لیکن اگر چھوٹ جائے تو پھر اسے ایام منیٰ (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ) میں قضا کرے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ایام منیٰ کی آخری تاریخ تک یہ تین روزے رکھے جا سکتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے، آپ نے فرمایا کہ حج کے دنوں میں اگر کوئی شخص روزے نہ رکھ سکے تو ایام تشریق (ایام منیٰ) میں رکھ لے۔ یہ قول عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عمر اور زبیر رضی اللہ عنہم سے بھی نقل ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن تک یہ روزے پورے کر لینے چاہئیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد یہ ہے کہ قربانی کا جانور میسر نہ آنے کی صورت میں "تین روزے حج میں رکھے"، اور حج عرفہ کے دن ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد حج کا احرام باندھنے والا دسویں تاریخ کو قربانی کے دن احرام کھول دیتا ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ قربانی کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اگر یہ اجماع کہ قربانی کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں اس وجہ سے ہے کہ وہ ایام حج ہی میں سے نہیں ہے تو باقی ایام تشریق میں روزے رکھنا بدرجۂ اولیٰ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں ان کا ایام حج میں سے نہ ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ اور اگر اس اجماع کی وجہ یہ ہے کہ قربانی کا دن (دس ذی الحجہ) عید کا دن ہے تو اس کے بعد کے دو دن بھی عید ہی کے دن ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں میں روزے رکھنے سے بھی اسی طرح منع فرمایا ہے جس طرح قربانی کے دن کے روزے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے اگر عرفہ کے دن تک روزے پورے نہیں ہوتے تو ان کے رکھنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے، روزے چھوٹ جانے کی وجہ سے اسے قربانی ہی کرنی پڑے گی، جو اللہ تعالیٰ نے اس پر پہلے ہی "تمتع" کی وجہ سے فرض کی تھی۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ حج تمتع میں اگر کوئی شخص قربانی نہ کر سکا تو اس کے بدلے میں جو تین روزے اسے زمانہ حج میں رکھنے ہوں گے وہ ایام تشریق تک رکھے جا سکتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ حج کرنے والے پر اللہ تعالیٰ نے اولاً قربانی واجب کی ہے، اور قربانی میسر نہ آنے کی صورت میں روزے واجب ہیں۔ اگر اسے قربانی کا جانور میسر ہوتا تو اس کی قربانی، قربانی کے دن یعنی دسویں تاریخ ہی کو کرتا، اس لیے روزے کی بھی اجازت اسی دن ہوگی جو قربانی کا دن ہے، کہ جب اصل اسے واقعی نہ میسر آسکی تو اس کا بدلہ دوسری صورت یعنی روزے رکھ کر دیدے۔ قربانی دسویں تاریخ اور اس کے بعد دو دن تک کی جاتی ہے، اس سے پہلے قربانی صحیح ہی نہیں ہوگی، اس لیے روزے رکھنے کا فیصلہ بھی اسی دن ہوگا جو قربانی کا دن ہے، کہ اگر واقعی اس دن بھی وہ مجبور ہے اور قربانی کے جانور کا انتظام نہیں کر سکتا تو اس کے بجائے تین روزے رکھے۔ قربانی دسویں تاریخ کی طلوع فجر کے بعد واجب ہوتی ہے، اب اگر اس وقت تک اسے قربانی کا جانور میسر نہیں تو .... روزے شروع کر دے، اور چونکہ تین دن کے روزے ہیں، اس لیے ایام تشریق کے آخر تک رکھے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ کہ ایام تشریق حج کے زمانہ سے خارج ہیں غلط ہے، کیونکہ ان دنوں میں بھی بہت سے اعمال حج، مثلاً قربانی، رمی وغیرہ، کیے جاتے ہیں۔ اپنی تائید میں احادیث بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کرنے والے کو جسے قربانی کا جانور میسر نہ آسکا ہو اور جو ذی الحجہ کی دس تاریخ تک روزے بھی نہ رکھ سکا ہو اس کی اجازت دی تھی کہ اس کے بدلے میں ایام تشریق میں روزے رکھ لے۔ زہری سے ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن حذافہ بن قیس رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور انھوں نے آں حضور کے حکم سے ایام تشریق میں یہ اعلان کیا کہ یہ دن کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں، سوا اس شخص کے جس پر قربانی کے بدلے کے روزے باقی رہ گئے ہوں۔

ان تین روزوں کے بارے میں، جو تمتع کی قربانی نہ میسر آنے کی صورت میں واجب ہیں، علماء کے اقوال مختلف ہیں کہ کس وقت ان کی ابتداء واجب ہو جاتی ہے اور کس وقت جائز ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حج کے مہینوں کی ابتداء میں ہی رکھ لینے چاہئیں۔ مجاہد اور طاؤس رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ حج کے مہینوں میں جب بھی یہ روزے

رکھ لئے کافی ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ ذی الحجہ میں اس کی دس تاریخ تک روزے پورے کرے، لیکن اگر شوال یا ذی قعدہ میں بھی روزے رکھتا ہے تو ادا ہو جاتے ہیں۔ آپ سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ اگر کوئی متمتع شوال میں ایک روزہ، دوسرا روزہ ذی قعدہ میں اور تیسرا روزہ ذی الحجہ میں رکھتا ہے تو ادا ہو جاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ روزے صرف ذی الحجہ کی ابتدائی نو تاریخوں میں ہی رکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے سوا دوسرے دنوں میں نہیں رکھے جا سکتے۔ عطاء بن ابی رباح اور ابو جعفر سے یہ قول نقل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ حج کے احرام سے بھی پہلے یہ روزے رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ قول عکرمہ اور عطاء سے روایت ہے اس کے بالمقابل یہ قول ہے کہ احرام سے پہلے جائز نہیں، حج کے احرام کے بعد ہی ان کی اجازت ہے۔ یہ قول ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ذی قعدہ میں رکھ لے تو جائز ہے۔

میری رائے میں راجح قول یہ ہے کہ متمتع قربانی کا جانور نہ میسر آنے کی صورت میں جو تین دن کے روزے زمانہ حج میں رکھے گا، وہ عمرہ کے بعد حج کا جب احرام باندھے گا تو ان روزوں کی ابتداء اسی وقت سے جائز ہے، اور حج کے آخری عمل کے ختم ہونے تک ان روزوں کے رکھنے کی آخری حد ہے، اس میں ایام منیٰ بھی آجاتے ہیں، البتہ قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) روزہ نہ رکھے، کیونکہ اس دن کا روزہ جائز نہیں۔ حج کے احرام سے پہلے یہ روزے اس لیئے جائز نہیں کہ جب تک حج کا احرام نہ باندھے گا اس وقت تک اس کا تعین نہیں ہو سکتا کہ وہ حج تمتع کرے گا بھی یا نہیں صرف نیت کا ہونا کافی نہیں سکتا، عملاً بھی جب احرام حج باندھے گا پھر اس کا متمتع ہونا متعین ہو جائے گا اور اس وقت اگر اسے قربانی کا جانور میسر نہیں ہے تو پھر روزے رکھنا چاہیئے۔

”وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ“ اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ حج تمتع کرنے والے کو اگر قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو تین روزے زمانہ حج میں رکھے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ ”اور سات روزے اس وقت رکھے جب اپنے گھر واپس آجائے“۔ گھر واپس آنے سے پہلے بھی یہ سات روزے رکھ سکتا ہے، لیکن گھر واپس آکر رکھنے کی تصریح رخصت اور بندوں پر رحمت و رافت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ مسافر اور مریض کو رمضان میں روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے، کہ جب سفر ختم ہو جائے یا صحت حاصل ہو جائے تو چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کر لے، وہی صورت یہاں بھی ہے۔ اگر متمتع مذکورہ صورت میں کوئی بار نہیں محسوس کرتا اور آسانی سے سفر حج یا مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ہی میں یہ سات روزے بھی رکھ سکتا ہے تو اسے ان روزوں کے رکھ لینے کی بھی اجازت ہے اور یہ ادا ہو جائیں گے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ رخصت ہے، اگر چاہے تو راستے میں بھی رکھ سکتا ہے اور اگر چاہے تو گھر واپس آکر رکھ لے۔ یہ قول منصور، عطاء اور ابراہیم رحمہم اللہ سے بھی نقل ہے۔ عطاء نے فرمایا کہ میرے نزدیک پسندیدہ یہی ہے کہ گھر واپس آکر ہی رکھے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرتا ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آیت کے اس ٹکڑے سے مراد ”گھر اور اپنے شہر واپس آنا ہے“، کیوں نہیں اس سے مراد منیٰ سے مکہ معظمہ کی واپسی لی جائے؟ تو یہ اعتراض صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ تمام اہل علم کا اسی مفہوم پر اتفاق ہے جو ہم نے بیان کیا۔ عطاء، قتادہ، ربیع اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے[1]۔

"تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" میں "کَامِلَةٌ" کے مفہوم کے سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ تین دن کے روزے زمانہ حج میں اور سات دن کے گھر واپسی کے بعد، پورے دس ہیں جو تمتع کی قربانی کا مکمل بدل ہیں۔ یہ قول حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "تمھیں پورا اس شخص جتنا ثواب ملے گا جو اپنے احرام کو حج کے اعمال کی ادائیگی سے پہلے نہ کھولتا اور تمہاری طرح عمرہ کے اعمال کی انجام دہی کے بعد حج تک احرام کھول کر مستفید نہ ہوتا۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت میں لفظ "کاملة" محض کلام کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد امر و حکم ہے، یعنی "کاملة"، "اکملوا" کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہوگا کہ دس روزے جو تم پر فرض ہیں وہ پورے کرو، اور اس میں کوتاہی سے کام نہ لو۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ "کاملة" کا دس کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی کافی ہیں۔

میرے نزدیک راجح تفسیر یہ ہے کہ "تِلْكَ عشرة كاملة" یعنی ہم نے تم پر ان کا پورا کرنا فرض کیا ہے یہ روزے اس قربانی کا بدل ہیں جو متمتع پر واجب تھی۔ دو مرحلوں میں ان روزوں کی تفصیل بتانے کے بعد ارشاد ہے کہ یہ دس دن کے روزے ہیں اور تم پر فرض ہے کہ تم ان سب کو رکھو، بظاہر تو ترکیب "خبر" کی ہے، لیکن معنی میں امر اور حکم ہی کے ہے۔

"ذَالِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" (یہ اس کے لیے جس کے اہل مسجد حرام کے قریب نہ رہتے ہوں)۔ یعنی حج تمتع جس کا بیان اوپر ہوا ان افراد کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے قریب رہتے ہوں، حج تمتع کرنا اہل مکہ کے لیے درست نہیں، بلکہ صرف وہ لوگ یہ حج کر سکتے ہیں جو مکہ معظمہ کے سوا دوسرے شہروں اور ملکوں سے حج کے لیے آئیں۔ یہ قول ربیع اور سدّی رحمہما اللہ سے روایت ہے۔ سدی نے فرمایا کہ حج اور عمرہ ایک ہی ساتھ، بیچ میں تمتع کے ساتھ، اس لیے جائز ہوا تاکہ دور سے آنے والوں کے لیے آسانی رہے اور وہ ایک ہی سفر میں دونوں انجام دے سکیں۔

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ آیت میں "جس کے اہل مسجد حرام کے قریب نہ رہتے ہوں" سے مراد حدودِ حرم کے تمام باشندے ہیں، لیکن اس کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ اس میں شامل ہیں یا نہیں؟ اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، یحییٰ بن سعید انصاری اور طاؤس رحمہم اللہ سے یہ رائے نقل ہے کہ اس سے مراد صرف اہل حرم ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل حرم کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو حدودِ میقات[ع] کے اندر

(حاشیہ متعلقہ صفحۂ گذشتہ) لے فقہاء احناف اور بعض اکابر تابعین سے یہ مفہوم نقل ہے کہ "اذا رجعتم" سے مراد اعمالِ حج سے فراغت ہے، یعنی باقی سات روزے اعمالِ حج سے فارغ ہو کر رکھ لے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی قول نقل ہے، ابن حیان نے البحر المحیط میں عطاء اور ابراہیم رحمہما اللہ سے بھی یہ قول نقل کیا ہے (مترجم)

(متعلقہ صفحۂ ھٰذا) ع "میقات" اس مقام کو کہتے ہیں جہاں پہنچ کر ہر حاجی پر حج یا عمرہ کی نیت اور احرام باندھ لینا واجب ہے۔ ہر سمت سے آنے والوں کے لیے میقات الگ الگ اس سمت کے مطابق ہے۔

آباد ہیں۔ یہ قول مکحول اور عطاء سے روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اہلِ حرم اور جن کے مکانات حرم سے متصل ہوں مراد ہیں۔ عطاء، زہری اور ابن زید سے یہ قول منقول ہے۔ عطاء کی روایت میں ہے کہ حرم سے متصل علاقوں، عرفہ، رجیع اور ضجنان وغیرہ کی آبادی بھی اہلِ حرم ہی کے حکم میں ہیں۔ امام زہری رح کی روایت میں ہے کہ حرم سے ایک دو دن کی مسافت پر داونٹ وغیرہ کی متوسط رفتار کے مطابق) جن کی آبادیاں ہوں وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔

میرے نزدیک صحت سے قریب قول یہ ہے کہ مراد وہ تمام آبادیاں ہیں جو مسجد حرام کے چاروں طرف اتنی مسافت پر ہیں جہاں سے مسجد حرام تک سفر میں نماز کے قصر کا حکم نہیں ہے۔ "حَاضِر" جو آیت میں استعمال ہوا ہے اس کا مفہوم کلام عرب میں "موجود و شاہد" ہے۔ "حَاضِرُ الشَّیْءِ" یعنی جو اس چیز کے پاس خود موجود ہو، اس لیے جس شخص پر مکہ معظمہ میں مسافر کا حکم لاگو ہوتا ہو وہ اس میں "حَاضِر" نہیں کہلا سکتا، اس کے برعکس جو اپنے گھر سے مکہ معظمہ پہنچ کر بھی شرعی مسافر نہیں ہوتا وہ "غائب" نہیں کہلا سکتا، وہ بھی مسجد حرام کے "حاضرین" میں شامل ہے۔

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" یعنی اللہ سے اس کے فرائض وحدود میں طاعت کے ذریعے ڈرتے رہو، اور مناسکِ حج کے سلسلے میں اس کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کرنے سے پرہیز کرو، جو تم پر اس سلسلے میں حرام ہیں انھیں حلال ہرگز نہ کرو، اور جان لو کہ اللہ کا عذاب ان لوگوں پر بہت سخت ہے جو اس کی حرمتوں کو توڑتے ہیں اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا

(زمانہ) حج چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں (شوال، ذیقعدہ اور دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے تو پھر (اس کو)

رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ

نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے۔ اور جو نیک کام کروگے

خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ

خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے۔ (جب حج کو جانے لگو) خرچ ضرور لے لیا کرو کیونکہ سب سے بڑی بات خرچ میں (گداگری)

وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

سے بچا رہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو مجھ سے ڈرتے رہو۔

احرام حج کے بعد

"اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" یعنی حج کے مہینے معلوم ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حج کے ان معلوم مہینوں سے مراد شوال اور ذی قعدہ مکمل اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتوں میں یہ قول نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین معلوم مہینوں کو

حج کے لیے رکھا ہے، سال کے باقی مہینے عمرہ کے ہیں۔ یہ قول سفیان، ابراہیم، شعبی، عامر، سدی، مجاہد، ضحاک اور عطار رحمہم اللہ کا ہے، اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ شوال اور ذی قعدہ کی طرح ذی الحجہ کا بھی پورا مہینہ حج کا مہینہ ہے۔ اس کی روایت بواسطہ نافع و مجاہد ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، اور عطار، ربیع، قتادہ، ابن طاؤس اور ابن شہاب رحمہم اللہ سے ہے۔ اس قول سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دس ذی الحجہ کے بعد حج کا کوئی عمل باقی رہ جاتا ہے، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ شوال اور ذیقعدہ کی طرح ذی الحجہ کا بھی پورا مہینہ حج ہی کا مہینہ ہے، اور تین مکمل مہینوں کو چھوڑ کر سال کے بقیہ مہینے عمرہ کے مہینے ہیں۔ چنانچہ نافع روایت کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (اَتِمُّوا الحَجَّ وَالعُمرَةَ لِلّٰہِ کی تشریح میں) اگر حج کے مہینوں سے عمرہ کو الگ اور عمرہ حج کے مہینوں کے سوا سال کے دوسرے مہینوں میں کرو تو تم اپنے حج کو بھی پورا کرلو گے اور عمرہ کو بھی پورا کرنے والے ہوگے۔

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ہم میں سے ایک عورت حج کر چکی ہے، یا حج کا ارادہ رکھتی ہے، تو کیا وہ حج کے ساتھ عمرہ بھی کر سکتی ہے؟۔ آپ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ یہ صرف حج ہی کے مہینے ہیں۔ قاسم بن محمد نے فرمایا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کی بکمال ادائیگی نہیں ہوتی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ محرم کے مہینہ میں؟ فرمایا کہ اس میں اگر کیا جائے تو مکمل ہوتا ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا کہ عمرہ محرم کے مہینہ میں مستحب ہے، کیونکہ یہ حج کا مہینہ نہیں ہے، فرمایا کہ عمرہ کو حج کے مہینوں میں بزرگوں نے مکمل نہیں خیال کیا۔

ابو یعقوب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ ذی الحجہ کی ابتدائی دس تاریخ تک عمرہ کرنے سے میرے نزدیک یہ زیادہ بہتر ہے کہ ان دس ابتدائی دنوں کے بعد آخر کے بیس دنوں میں کیا جائے[۱]۔

---

[۱] اس باب میں عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد صحیح بخاری میں بھی دوسرے الفاظ کے ساتھ موجود ہے "اَتِمُّوا الحَجَّ وَالعُمرَةَ لِلّٰہِ" کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمیں کتاب اللہ پر عمل کرنا چاہیئے، کہ اس میں کمال کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تشریح میں خود علماء کی رائے متحد نہیں ہے۔ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس ارشاد سے اس عمل سے روکا ہے کہ کوئی شخص پہلے حج کا احرام باندھے اور پھر اسے فسخ کر کے، حج تمتع کی نیت سے، عمرہ کا احرام باندھ لے، آپؓ نے فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے۔ اس توضیح کی روشنی میں ابن جریرؒ کے پیش کردہ زیر بحث قول کے اکثر دلائل و اقوال کا منشا ہی دوسرا ہو جاتا ہے، اور اس سے وہ مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا جو زیر بحث قول کے قائل حضرات نے اخذ کیا ہے۔ لیکن علماء کی ایک جماعت، جس میں امام نووی بھی شامل ہیں، یہ کہتی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حج قران اور حج تمتع سے منع کیا ہے۔ اس تشریح کی بنیاد پر زیر بحث قول کے دلائل کے طور پر عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات کے اقوال پیش کرنا صحیح ہوگا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو عمر رضی اللہ کے ارشاد کا یہ مفہوم ہی نہیں۔ اصل میں عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر ایک الگ نقطۂ نظر سے غور کر رہے ہیں۔ آپ چاہتے یہ ہیں کہ بیت اللہ سال کے کسی حصہ میں خالی نہ رہے، لوگوں کا ہمیشہ اور ہر وقت اللہ کے اس پاک گھر کی طرف رجوع پورے ذوق و شوق کے ساتھ باقی رہے۔ قران و تمتع میں آدمی حج و عمرہ ایک ہی سفر میں کر لیتا ہے۔ لیکن اگر لوگ حج افراد کرنے لگیں، اور حج کے مہینوں میں صرف حج ہی کی ادائیگی تک محدود رہیں، تو پھر صاحب استطاعت (باقی بر ص ۳۵)

محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمام اہلِ علم کے نزدیک یہ مسئلہ شبہ سے بالا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے سے ان مہینوں کے سوا سال کے دوسرے مہینوں میں عمرہ کرنا افضل ہے۔ اس کی نظائر بہت ہیں، اور اگر سب کو بیان کیا جانے لگے تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج کے مکمل تین مہینے ہیں۔ اگرچہ حج ان کے بعض مخصوص دنوں ہی میں انجام دیا جا سکتا ہے، لیکن بہرحال وہ سب اس معنیٰ میں حج کے مہینے کہلاتے ہیں کہ ان میں عمرہ کرنا مستحسن نہیں۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ حج کے مہینے شوال اور ذی قعدہ کے علاوہ ذی الحجہ کے صرف ابتدائی دس دن ہیں، انکا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آیت "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" میں صرف حج کا وقت بتایا گیا ہے، عمرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، اور نہ اس سے اس آیت کے ضمن میں زیرِ بحث لانے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ عمرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ احادیث میں موجود ہے کہ خود حضور اکرمؐ نے عمرہ حج کے بعض مہینوں میں ادا کیا (عمرہ حدیبیہ کی ادائیگی بھی ذی قعدہ میں کی)۔ اس کے بعد آپؐ سے کبھی اس کے خلاف نہیں سنا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمرہ سال کے کسی بھی حصے میں کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ حج دس ذی الحجہ کو ختم ہو جاتا ہے، اس لیے آیت زیرِ تفسیر میں بھی "حج کے مہینوں" سے دو مکمل اور تیسرے مہینہ، یعنی ذی الحجہ کا بعض حصہ مراد ہوگا۔ ہمارے نزدیک بھی یہی قول صحیح ہے۔ آیت میں حج کا وقت بیان کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ ایامِ منیٰ کے بعد حج کا کوئی عمل باقی نہیں رہتا، اس لیے تیسرے مہینے، یعنی ذی الحجہ کے تمام دن کس طرح مراد لیے جا سکتے ہیں! بس صحیح قول یہی ہو سکتا ہے کہ ذی الحجہ کے صرف ابتدائی دس دن "حج کے معلوم مہینوں" میں داخل ہیں۔ کلامِ عرب میں جمع کا صیغہ (جیسا کہ آیت میں "اشھر" استعمال ہوا ہے) اس وقت بھی عام طور سے استعمال کرتے ہیں جبکہ دو مکمل اور تیسرے کا صرف بعض حصہ مراد ہو، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ مکمل تین سے کم اگر مہینے مراد لیے جائیں تو "اشھر" جمع کے ساتھ صحیح نہیں ہوگا۔ اسی طرح تثنیہ (دو کے لیے) کے صیغہ کا ایک مکمل، دوسرے کے بعض حصے کے ساتھ، پر بھی اطلاق کرتے ہیں، مثلاً ڈیڑھ یا سوا دن کے لیے "یَوْمَانِ" (تثنیہ، دو دن) کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید میں خود آیا ہے "فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ" (جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے اس پر کوئی گناہ نہیں)، حالانکہ مراد ایک مکمل دن کے ساتھ دوسرے دن کا صرف آدھا حصہ ہے۔ انسان ایک کام تھوڑی دیر میں کر لیتا ہے اور پھر اسے پورے دن، بلکہ بعض اوقات پورے سال کی طرف منسوب کر کے بیان کرتا ہے، مثلاً "میں نے اسی سال فلاں شخص سے ملاقات کی"، "میں آج ہی اس کے پاس گیا تھا"، یہی صورت آیت میں بھی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۴) لوگ عمرہ کے لیے بھی خاص طور سے سفر کر کے آیا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوبارہ سفر کی استطاعت ہی نہیں رکھتے ان کے لیے تو افراد کے مقابلہ میں تمتع و قران کے افضل ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں لیکن اگر کوئی اس طرح کرتا ہے کہ صرف حج کے لیے ایک سفر اور پھر دوبارہ صرف عمرہ کے لیے ایک الگ سفر اختیار کرتا ہے تو افراد کی یہ صورت یقیناً افضل ہوگی۔ دو سفروں میں افراد کی صورت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی "موطا" میں لکھی ہے اور اس کی افضلیت کی تصریح کی ہے۔ شیخین سے اس میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے اور یہی وہ صورت ہے جسے عمر رضی اللہ عنہ نے پسند کیا تھا۔ (مترجم)

"فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ" پس جس نے ان مہینوں میں حج کو اپنے اوپر واجب کیا۔ اپنے اوپر واجب کرنے کا مطلب ہے "یہ ارادہ کرنا کہ اللہ نے حاجی پر جو کچھ واجب کیا ہے اس کی ادائیگی کرے گا اور جن سے روکا ہے ان سے رکے گا"، آیت میں "فرض" کا مفہوم عام مفسرین کے نزدیک "واجب کرنا، لازم کرنا" ہے، لیکن اس سلسلے میں رائے مختلف ہے کہ حج واجب ولازم ہوتا کس عمل کے ذریعے ہے؟۔ ایک قول یہ ہے کہ حج لازم نیت اور تلبیہ کہنے سے ہوجاتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ، عطاء، سفیان ثوری، مجاہد، ابراہیم، طاؤس اور قاسم بن محمد رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے، قاسم بن محمد کی روایت میں ہے کہ غسل کرکے تلبیہ کہتے ہوئے احرام کا کپڑا پہن لینے سے حج واجب ولازم ہوجاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ احرام باندھ لینے سے حج واجب ہوجاتا ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابراہیم، عطاء، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ ان حضرات نے فرمایا کہ "احرام" سے حج لازم ہوجاتا ہے۔ لیکن اس قول میں ابہام ہے۔ ممکن ہے اس سے نیت اور اعمال حج کے لیئے نیت کے ساتھ تلبیہ کہنا مراد ہو، جیساکہ پہلے قول میں کہا گیا ہے اور ممکن ہے اس سے مراد عزم وارادہ حج ہو، جیساکہ ہماری رائے ہے، یعنی احرام سے مراد یہ عزم وارادہ لیا جائے جس کے ذریعہ مُحرِم اپنے اوپر وہ امور لازم کرلیتا ہے جو حج کرنے والے پر لازم ہیں۔ ہم نے یہ قول اس لیئے پسند کیا کہ یہی ایک ایسی جامع صورت ہے جو بہرحال حج کے اُمور شروع کرنے کے لیئے ضروری ہے۔

"فَلَا رَفَثَ" (تو "رفث" نہ ہونے پائے) بعض مفسرین نے "رفث" کے معنی عورت کے ساتھ فحش اور موجبِ شہوت باتیں کرنا، مراد لیئے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ جب احرام کھولیں گے تو یہ کریں گے اور وہ کریں گے، صاف اور واضح طور پر ایسی باتیں کہنا "رفث" ہے یہ قول ابن عباس، ابن زبیر اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم، عطاء، طاؤس، ابوالعا سے نقل ہے۔ اس میں بوس وکنار اور جماع ومباشرت کے مبادی آجاتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "رفث" سے آیت میں مراد جماع ومباشرت ہے۔ یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتوں میں منقول ہے۔ حسن، عمرو بن دینار، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، سدی، ربیع، ابراہیم، عکرمہ، ضحاک اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اس قول کی روایت ہے۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی روایت ہے ابنِ زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَاُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ" (جائز کردیا گیا ہے تمہارے لیئے روزوں کی رات میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا) میں بھی "رفث" سے جماع ہی مراد ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ کلام عرب میں یہ لفظ اصلاً "فحش گوئی" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ معنی اصلی تو یہی ہیں، لیکن کنایۃً اسے "جماع ومباشرت" کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ اہل علم کی رائے اس آیت میں اس لفظ کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں مختلف ہے، یعنی یہ کہ یہاں محرم کو ان تمام امور سے روکا گیا ہے جن پر لفظ "رفث" کا اطلاق ہوسکتا ہے یا ان میں سے صرف بعض مخصوص امور سے ہی روکا گیا ہے۔ تو ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم وہ تمام ہی امور مراد لیں جن پر اس لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے، کیونکہ جب تک قرآن وحدیث سے اس کا تعین نہ ہوجائے کہ آیت میں صرف بعض ہی امور ان سے مراد ہیں، ہمیں تمام ہی امور مراد لینے پڑیں گے (جس میں جماع اور دواعی جماع تمام امور آجاتے ہیں) ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث سے اسکا

کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بعض ہی امور مراد ہیں۔

"وَلَا فُسُوْقَ" مفسرین اس کی تفسیر میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ بعض حضرات نے "فسوق" سے مراد گناہ لیے ہیں، خواہ وہ کسی قسم کے ہوں۔ مفہوم یہ ہوگا کہ "اور کوئی گناہ نہ ہونے پائے"۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ، عطاء، حسن، طاؤس، مجاہد، محمد بن کعب قرظی، قتادہ، سعید بن جبیر، ابراہیم، ربیع، عکرمہ اور زہری رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں مراد "فسوق" سے خاص احرام کے سلسلے کی عدول حکمی ہے یعنی حالتِ احرام میں جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا کہ شکار نہ ذبح کیا جائے، بال یا ناخن نہ ترشوائے جائیں وغیرہ، انمیں سے کسی میں حکم عدولی نہ ہونے پائے۔ یہ روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "فسوق" سے آیت میں مراد گالم گلوج ہے، یعنی گالم گلوج نہ ہونے پائے۔ اس تفسیر کی روایت بھی ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے۔ سدی، ابراہیم، عطاء بن یسار اور مجاہد رحمہم اللہ سے بھی اس تفسیر کی روایت ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد "بتوں کے لیے ذبح کرنا" ہے۔ اس کی روایت ابن زید سے ہے۔

پانچواں قول، جس کی روایت ضحاک بن مزاحم سے ہے، یہ ہے کہ مراد "لوگوں کے بُرے نام رکھنا" ہے۔

میرے نزدیک راجح تفسیر ان حضرات کی ہے جنھوں نے کہا کہ آیت میں "فسوق" سے مراد خاص حالتِ احرام سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام سے محرم کی عدول حکمی ہے۔ ذکر حج ہی کا ہے، اور اس سے پہلے "لا رفث" میں بھی خاص حالتِ احرام ہی کے ایک ممنوع عمل سے روکا گیا ہے۔ اس لیے "فسوق" سے بھی اسی قبیل کے اعمال سے ممانعت ہوگی۔

"وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ" کی تفسیر بھی مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آیت میں کہا گیا ہے کہ محرم کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ جن حضرات نے یہ تفسیر کی ہے ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ آیت میں محرم کو جھگڑا کر کے اپنے ساتھی کو ناراض کرنے سے روکا گیا ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، عطاء، سعید بن جبیر، مجاہد، عمرو بن دینار، حسن، ضحاک، ربیع، ابراہیم، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "جدال" سے آیت میں مراد گالم گلوج اور لڑائی جھگڑا ہے۔ (خواہ کسی سے ہو)۔ ابنِ عمر ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ سے اس کی روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد عام جھگڑا نہیں ہے، بلکہ وہ خاص بحث وجدال مراد ہے جو قریش موسم حج میں منیٰ میں جمع ہو کر کرتے تھے، کچھ لوگ کہتے کہ ہمارا حج تمہارے مقابلہ میں زیادہ کامل ہے، اور ان کے مقابلہ کے کچھ لوگ اپنے حج کو زیادہ کامل ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ محمد بن کعب قرظی ؒ سے اس کی روایت ہے۔ قاسم بن محمد سے چوتھی روایت ہے کہ اس سے مراد ان کا آپس کا حج کے دن کے سلسلے میں اختلاف ہے، بعض کہتے حج آج ہے اور بعض اس کے مقابلہ میں کہتے کہ حج کل ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ موقفِ ابراہیم کے بارے میں عرب جاہلیت کا اختلاف مراد ہے، ابنِ زید رحمۃ اللہ علیہ نے

فرمایا کہ وہ لوگ مختلف جگہوں پر ٹھہرتے اور ہر فریق اس کا دعویٰ کرتا کہ یہی موقف ابراہیمؑ ہے۔ آیت میں اس نزاع واختلاف سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تمام مناسکِ حج بتا دیئے ہیں۔ اختلاف ونزاع کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔

چھٹا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "حج میں کوئی شبہ نہیں رہا" اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ حج کا وقت متعین ہوگیا ہے، اس میں اب کسی قسم کی تقدیم وتاخیر نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی مہینے کو حذف کیا جاسکتا ہے۔ اس کی روایت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اہلِ عرب زمانہ جاہلیت میں دوقتی ضروریات کے پیشِ نظر کبھی محرم کے مہینے کو حذف کردیتے، کبھی صفر اور ربیع الاول کے مہینوں کو "صفران" (دو صفر) کا نام دیتے کبھی ربیع الآخر اور جمادی الاول کے مہینوں کو "شَهْرَا رَبِيعٍ" (ربیع کے دو مہینے) کہتے، کبھی جمادی الاخریٰ اور رجب کو "جمادیان" (دو جمادی) کہتے، کبھی وہ شعبان کو رجب بنا دیتے، کبھی رمضان کو شعبان! کبھی شوال کا نام رمضان رکھ لیتے، کبھی ذی قعدہ کو شوال کر لیتے اور ذی قعدہ کو ذی الحجہ کہتے، کبھی محرم کو ذی الحجہ بنا لیتے اور اس طرح محرم کے مہینے میں حج کرتے۔ مہینوں کا شمار وہ انھیں غلط بنیادوں پر غلط ناموں کے ساتھ کرتے، اور سال میں دو دو مرتبہ حج کر لیتے۔ اس غلط شمار کے ساتھ وہ محرم میں ایک حج کرلیا کرتے تھے، تاکہ سال میں دو حج کرسکیں۔ ارشاد ہے کہ اب اللہ تعالیٰ نے حج کا وقت متعین کر دیا ہے، اس لیے نہ اس میں تقدیم وتاخیر ہوسکتی ہے اور نہ کسی مہینہ کا درمیان میں حذف واضافہ کیا جاسکتا۔

اس قول کی روایت سدی سے بھی ہے۔

مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ اہلِ عرب دو سال ذی الحجہ میں حج کرتے، دو سال محرم میں کرتے، اس طرح وہ سال کے ہر مہینے میں دو دو سال حج کیا کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو سب سے پہلا حج کیا وہ ذی قعدہ میں تھا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج سے ایک سال پہلے تھا۔ پھر آں حضورؐ نے دوسرے سال ذی الحجہ کے صحیح مہینہ میں حج کیا۔ حضور اکرمؐ کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ گھوم کر پھر ٹھیک اس دن کے مطابق ہوگیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کی تھی۔

ان تمام اقوال میں راجح تفسیر یہ ہے کہ "حج کے سلسلے میں جاہلیت کے نزاع واختلاف باطل ہوگئے"۔ اب اس کے وقت اور مناسک کے سلسلے میں اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان تمام امور کی تعیین کردی ہے، اب حج کا ایک متعین وقت ہے اور اس کے مناسک بھی متعین ہیں۔ اس تفسیر کے راجح اور پسندیدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ ارشاد تھا کہ "حج کے مہینے متعین ہیں" اور اب اس کے بعد ان اختلافات اور جھگڑوں کو باطل قرار دیا جارہا ہے جو جاہلیت میں اس سلسلے میں موجود تھے۔ اس سے پہلے "لَا فُسُوْقَ" کی تفسیر کے ذیل میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ معاملات حج ہی کا بیان ہو رہا ہے، اس لیے اس ضمن میں جو کچھ بھی ارشاد ہوگا وہ خاص حج ہی سے متعلق ہوگا، ان امور کے بیان کی یہاں کوئی وجہ نہیں ہوسکتی جو حج کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی جائز نہیں، کہ وہ تو ہر حال جائز نہیں ہیں، حج کے خصوصی بیان میں ان کے ذکر کی آخر ضرورت کیا ہوسکتی ہے! ناحق اپنے ساتھی کو ناراض کرنا، اس کے لیے باعثِ آزار بننا ہر حال میں ممنوع ہے۔ گالی دینا بھی گناہ ہے، حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اور قتل کرنا کفر ہے۔ یہ امور تو ہر حال میں گناہ ہیں، اس لیے حج کے خصوصی موقعہ پر مراد نہیں لیے جاسکتے

ان سے بھی قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی اس تفسیر کے راجح ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے اس گھر کا حج کیا، اور دورانِ احرام میں نہ کوئی عورت سے فحش بات (رفث) کی اور نہ بے حکمی (فسوق) کی تو وہ یہاں سے اس دن کی طرح نکلے گا (بے گناہ) جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی بعض روایتوں میں ہے کہ "وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسا کہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا"، بعض روایتوں میں یہ ہے کہ "اپنے گھر کی طرف اس طرح لوٹے گا" الخ مذکورہ بالا مضمون کی متعدد روایتیں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی منقول ہیں۔ اس حدیث میں آیت میں مذکور تین امور "رفث"، "فسوق" اور "جدال" میں سے صرف پہلے دو امور کا ذکر ہے، کہ جو شخص اپنے حج میں ان سے بچا رہے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنے مخصوص اکرام سے نوازیں گے اور اس کے گناہ معاف کر دینگے اگر "جدال" کا مفہوم آیت میں وہ نہ ہوتا جو ہم نے لیا ہے تو "رفث وفسوق" کے ساتھ اس کا بھی ذکر ہونا چاہیئے تھا، حدیث کی تمام روایتوں میں اس کے بغیر صرف دو پہلے ہی امور کو ذکر کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس میں کسی چیز سے نہی و ممانعت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خبر و اطلاع ہے کہ حج کے مناسک اور وقت کے سلسلے میں جاہلیت کے تمام نزاع و اختلاف باطل ہو گئے۔ اگرچہ "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" میں صحیح قراءت یہی ہے کہ تینوں کا اعراب ایک ہی پڑھا جائے، لیکن میرے نزدیک پسندیدہ قراءت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے "رفث"، اور "فسوق"، پر ضمہ مع التنوین پڑھا ہے اور "جدال" پر نصب پڑھا ہے، تاکہ دونوں ٹکڑوں کے مفہوم کا اختلاف عبارت میں بھی صاف ہو جائے یہ قراءت بصرہ کے قاریوں کی ایک جماعت اور اکثر اہلِ مکہ کی ہے۔

"وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ" یعنی اے مسلمانو! میں نے حج کے فرائض اور اس کے مناسک کی پوری طرح ادائیگی اور اس کے ممنوعات سے اجتناب کا جو تمھیں حکم دیا ہے تو اس پر عمل تمہارے لیے بہت بڑے ثواب کا باعث ہوگا، کیونکہ "تم جو بھی نیک کام کرو گے اللہ اسے ضرور جان لے گا"، اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ تمام چھپی ہوئی اور ظاہر چیزوں کو جانتا ہے۔

"وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ"، (اور زادِ راہ لے لیا کرو، اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے) بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو بغیر زادِ راہ کے سفرِ حج کے لیے نکل پڑتے تھے، کچھ ایسے بھی تھے کہ احرام باندھتے وقت جو کچھ زادِ راہ ہوتا وہ پھینک دیتے اور دوسرا نیا زادِ راہ اٹھا لیتے۔ اس لیے آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو سرے سے زادِ راہ ساتھ لیتے ہی نہیں تھے، اسے ساتھ لینے کا، اور جو موجود زادِ راہ کو پھینک دیتے انھیں اس کی حفاظت کا حکم دیا۔ نافع ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ احرام باندھتے وقت اپنے پاس موجود زادِ راہ پھینک دیتے اور اس کے بجائے نیا زادِ راہ ساتھ لیتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ ایسا نہ کریں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بعض لوگ سفرِ حج میں زادِ راہ ساتھ نہیں لیتے تھے، اس لیے حکم ہوا کہ سفرِ حج کے لیے نکلتے وقت زادِ راہ بھی لے لیں، اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے۔ اس مضمون کی روایتیں سعید بن جبیر، عکرمہ، شعبی، سالم، ابراہیم، مجاہد، حسن، سعید بن ابی عروبہ، قتادہ، ربیع، ضحاک، سفیان اور ابنِ زید رحمہم اللہ سے نقل ہیں۔ ابراہیم کی روایت میں ہے کہ کچھ اعرابی حج کے لیے بغیر زادِ راہ کے نکل پڑتے تھے اور

اور کہتے تھے کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ مجاہد کی روایتوں میں ہے کہ مکہ معظمہ کے اطراف کے کچھ لوگ زادراہ کے بغیر نکل پڑتے اور پھر لوگوں سے مانگتے اور کہتے کہ ہمارا توکل اللہ پر ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ زادراہ ساتھ لے لیا کریں مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ اہل یمن ایسا کیا کرتے تھے۔ قتادہ اور حسن کی روایت میں بھی اہل یمن ہی کا ذکر ہے۔ عبدالملک بن عطا، بکالی کہتے ہیں کہ شعبی نے فرمایا کہ "زادِ راہ" سے مراد کھانا ہے۔ میں نے پوچھا کہ "کھانا" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ کھجور، ستو، اور یہ بھی اس زمانہ میں بہت کم تھے۔ ضحاک نے فرمایا کہ دنیا کا زادراہ لباس، کھانے، پینے سے نفع حاصل کرنا ہے۔ مختلف روایتوں میں زادراہ سے مراد ستو، آٹا، کھجور اور زیتون وغیرہ لیا گیا ہے۔ ان روایتوں کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جب حج کے مہینوں میں احرام باندھو تو تمام فرائض ومناسک کی پوری طرح ادائیگی کرو اور جن چیزوں سے تمھیں روکا گیا ہے ان سے رکے رہو، اللہ نے حج کے تمام امور تمھیں بتادیئے ہیں اور ان کی تعیین کردی ہے، اس لیئے اس کے احکام ومنہیات کے سلسلے میں تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ تم جو بھی نیک کام کروگے اس کا اللہ کو علم ہوگا، اور اپنا زادراہ اپنے ساتھ رکھو، تاکہ فرائض ومناسک کی ادائیگی اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ کرسکو، اس میں کوئی نیکی نہیں کہ زادراہ ساتھ نہ لو اور پھر لوگوں سے مانگتے پھرو، اور نہ زادراہ کو ضائع کردینا کوئی نیک کام ہے، بلکہ نیکی اللہ رب العزت سے تقویٰ میں ہے کہ اس نے حج میں جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کی بجا آوری کرو، اور جن چیزوں سے روکا ہے ان سے اجتناب کرو، کہ یہی سب سے بہترین زادِراہ ہے۔ ضحاک بن مزاحم رح نے فرمایا کہ "تقویٰ" سے مراد اللہ کی طاعت ہے۔ اس سے پہلے ہم "تقویٰ" کے معنیٰ بیان کرچکے ہیں۔

"وَاتَّقُونِ یَا اُولِی الْاَلْبَابِ" یعنی اے اصحابِ عقل وفہم، میرا ہی تقویٰ اختیار کیئے رہو، حج کے سلسلے میں میرے فرائض ومناسک کی ادائیگی اور میری تمام شریعت پر عمل کرکے اور میری سزا سے ڈرو اور میری حرام کی ہوئی چیزوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ خاص طور سے "اہلِ فہم" سے خطاب اس لیئے کیا کہ انھیں لوگوں کو حق وباطل میں تمیز ہوتی ہے، اور انھیں کو فکرِ صحیح حاصل ہے اور وہی حقائق کی معرفت رکھتے ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ

تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پھر جب

اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪

تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس (مزدلفہ میں شب کو قیام کرکے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝

اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے (نہ یہ کہ اپنی رائے کو دخل دو) اور حقیقت میں قبل اس کے تم محض ناواقف ہی تھے

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ

پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جاکر واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں پرانی رسموں پر عمل کرنے)

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳﴾

خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرمائینگے۔

ہم خرما و ہم ثواب

"وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ"۔ "جُنَاحٌ" بمعنی حرج ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ "احرام سے پہلے اور احرام کے بعد خرید و فروخت میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔" "اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ" یعنی اپنے پروردگار کے ہاں سے فضل (معاش) تلاش کرنے میں "(کوئی حرج نہیں)۔ بولتے ہیں "اِبْتَغَيْتُ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ" یعنی میں نے اللہ کا فضل تلاش کیا "ابتغاء و بغی" بمعنی طلب والتماس استعمال ہوتے ہیں۔

مفسرین نے کہا ہے کہ "اِبْتِغَاءُ فَضْلٍ مِّنَ اللّٰهِ" کا مفہوم ہے "تجارت کے ذریعہ اللہ کی روزی کی تلاش" ان کا خیال ہے کہ کچھ لوگ سفر حج میں تجارت صحیح نہیں سمجھتے تھے، وہ تجارت نہ کرنا ہی نیکی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے، بلکہ انھیں اس سفر میں بھی خرید و فروخت کے ذریعہ اللہ کے فضل کی تلاش کرنی چاہیئے یہ تفسیر مجاہد، بریدہ، عکرمہ، منصور بن معتمر، عطاء، سعید بن جبیر، سدی، ربیع بن انس، ابراہیم، قتادہ رحمہم اللہ اور عمر، ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ ابو امامہ تیمی روایت کرتے ہیں کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ ہم تاجر لوگ ہیں، تو کیا ہمارا حج صحیح ہے؟ اس پر آپؓ نے فرمایا۔ کیا تم بیت اللہ کا طواف نہیں کرتے؟ عرفہ نہیں جاتے؟ کنکری نہیں پھینکتے؟ سر نہیں منڈاتے؟۔ میں نے عرض کی کہ ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آں حضورؐ سے بھی یہی سوال کیا، آں حضورؐ نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جبریل علیہ السلام آئے اور مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ آں حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ تمہارا حج صحیح ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ عکاظ اور ذوالمجنہ (موسم حج میں) جاہلیت کے بازار تھے۔ اسلام کے بعد گویا لوگوں نے یہاں خرید و فروخت غیر مناسب سمجھی۔ اس پر زیر تفسیر آیت نازل ہوئی۔ مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ ان بازاروں میں موسم حج کے موقع پر تجارت ہوا کرتی تھی، البتہ مشرکین قیام عرفہ کے دن خرید و فروخت نہیں کرتے تھے۔ اسی مضمون کی روایت قتادہ سے بھی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ مسلمان موسم حج میں تجارت پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ذکر کے دن ہیں۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

حج کے چند بنیادی اعمال

"فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ" (پھر جب تم عرفات سے واپس ہونے لگو)۔ "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ" یعنی پھر جہاں سے تم نے ابتداء کی ہے وہاں سے واپس ہونے لگو۔ عرفات[1] جمع کا وزن ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصلاً یہ صیغہ اگرچہ جمع کے لیے ہے لیکن یہاں

---

[1] مکہ معظمہ سے جانب مشرق میں طائف کو جاتے ہوئے، تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر عرفات پڑتا ہے۔ یہ کئی میل کے رقبہ کا لمبا چوڑا میدان ہے۔ اسی نام کی ایک پہاڑی بھی اس میدان میں ہے۔ سال بھر یہ میدان بالکل سنسان پڑا رہتا ہے، صرف ایک دن (باقی بر صفحہ آئندہ)

مراد ایک ہی قطعۂ زمین ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ خاص میدانِ عرفہ اور اس کے اطراف کو عرفات کہا گیا ہے۔ بعض علماء اس میدان کے "عرفات" نام کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو فوراً پہچان گئے تھے، کیونکہ آپ کو اس کے اوصاف و خصوصیات معلوم تھیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا تھا کہ "قَدْ عَرَفْتُ" (میں نے پہچان لیا)۔ یہ ان حضرات کی رائے ہے جو کہتے ہیں کہ عرفات نام تو ہے اس خاص میدان کا، لیکن نام رکھنے میں اس خاص میدان کے ساتھ اس کے اطراف کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ سُدّی سے روایت ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا تو انھوں نے اس کا جواب تلبیہ (اللھم لبیک الخ) سے دیا اور وہاں جسے آنا تھا وہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ عرفات کی طرف جائیں اور اس کے اوصاف آپ سے بیان کردیئے تھے۔ چنانچہ آپ نکل پڑے۔ جب آپ مقام عقبہ کے درخت کے پاس پہنچے تو شیطان آپ کے سامنے آگیا اور آپ کو واپس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں، اور ہر کنکری پر آپ تکبیر کہتے جاتے تھے۔ اس وقت شیطان بھاگ گیا۔ لیکن جب آپ جمرہ ثانیہ (جہاں دوسری مرتبہ کنکری ماری جاتی ہے) پہنچے تو پھر اس نے آپ کو روکنے کی کوشش کی، اس وقت بھی آپ نے اسے کنکری ماری۔ وہاں سے بھی وہ بھاگ گیا۔ جمرہ ثالثہ (جہاں تیسری مرتبہ کنکری ماری جاتی ہے) کے موقع پر پھر شیطان سدِّ راہ ہوا، اس وقت بھی آپ نے تکبیر کہتے ہوئے اسے کنکری ماری۔ شیطان بھی سمجھ گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اس کی ماننے والے نہیں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر جائیں، اتنے میں آپ مقام "ذوالمجاز" پر پہنچے، آپ نے اس مقام کو دیکھا اور نہ پہچان کر گذر گئے، (جَازَ) اسی لیے اس کا نام "ذوالمجاز" پڑا۔ آپ آگے بڑھے اور عرفات میں پہنچ گئے۔ اسے دیکھتے ہی اس کے اوصاف کی وجہ سے پہچان گئے اور فرمایا کہ "قَدْ عَرَفْتُ" (میں پہچان گیا)۔ پھر ابراہیم علیہ السلام وہیں عرفات کے میدان میں شام تک ٹھہرے، شام کے وقت آپ مزدلفہ سے قریب ہوئے، اور اسی لیے اس کا نام "مزدلفہ" پڑا اور وہاں آپ نے قیام کیا۔ عرفات نام پڑنے کی وجہ کے سلسلے میں مذکورہ بالا وجہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور نعیم بن ابی ہند کی روایتوں میں بھی اختصاً کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ عرفات نام اس خاص میدان اور اس کے سوا دوسرے مقامات کی وجہ سے پڑا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ عرفات نام اس لیے پڑا کہ جبریل علیہ السلام مناسکِ حج کو دکھاتے وقت فرماتے جاتے تھے کہ یہ فلاں مقام ہے، یہ فلاں مقام ہے، اور ابراہیم علیہ السلام فرماتے کہ میں نے پہچان لیا اسی مناسبت سے اس خاص میدان کا نام عرفات پڑا۔ اختصار کے ساتھ یہ قول عطاء سے بھی نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اصلاً یہ اس پہاڑ کا نام ہے جو وہاں پر ہے اور اس کے بعد حج میں ٹھہرنے کی جگہ پر۔ ابن ابی نجیح نے فرمایا کہ مقام تبعہ، تبیعہ اور ذات البنات کے مجموعہ کا نام عرفات ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد "ثم اِ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۹ ذی الحجہ کو انسانوں اور سواریوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ حج کے واجبات و سنن تو بہت ہیں، لیکن فرض صرف تین ہیں، احرام پوشی، ۹ ذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں حاضری اور طواف فرض۔ ان تینوں میں اہم ترین یہی عرفہ کی حاضری ہے۔ (مترجم)

"فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" یعنی جب تم عرفہ سے اس طرف لوٹنے لگو جہاں سے عرفہ کی طرف روانگی کی ابتداء کی تھی "تو مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کر لیا کرو"۔ اللہ کے ذکر سے مراد نماز و دعاء ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ "مَشْعَر" بمعنی علامت و نشانی ہے "شَعُرْتُ بِهٰذَا الْاَمْرِ" سے ماخوذ ہے، یعنی میں اس معاملہ کو سمجھ گیا، جان گیا۔ "مَشْعَر"[1] اس مقام کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں نماز پڑھنا، ٹھہرنا، رات گذارنا اور دعاء کرنا حج کی نشانیوں اور اس کے واجبات میں سے ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ابن ابی نجیح نے فرمایا کہ حاجی کے لیے مستحب ہے کہ اگر ہو سکے تو نماز مزدلفہ میں اپنے پڑاؤ پر پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ "مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کر لیا کرو، اور اس کا ذکر اس طرح کرو جس طرح اس نے تمھیں بتایا ہے"۔ "مشعر" سے مراد وہ مقام ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان میں ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے دیکھا کہ لوگ مزدلفہ کی پہاڑی پر ہی ہجوم کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ تمام مزدلفہ "مشعر" ہے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ پہاڑی اور اس کے چاروں طرف کا علاقہ مشعر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان کا علاقہ مشعر ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے "مشعر الحرام" کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ رہو تو میں تمھیں دکھا دوں گا۔ چنانچہ جب لوگ عرفہ سے واپس ہونے لگے اور سواریاں پہاڑ کے دامن میں پہنچیں تو آپ نے فرمایا کہ "مشعر حرام" کے متعلق سوال کرنے والا کہاں ہے؟ پھر فرمایا کہ جب سواریاں پہاڑ کے دامن میں پہنچ جائیں تو وہاں سے مکہ تک "مشعر" ہے۔ مکحول ازدی کی روایت میں ہے کہ میں نے "مشعر حرام" کے متعلق ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو آپ مجھے مزدلفہ تک ساتھ لے گئے اور وہاں پہنچ کر فرمایا کہ یہی "مشعر" ہے۔ مجاہد، عطاء، قتادہ، سُدّی، ربیع، سعید بن جبیر رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے کہ "مشعر حرام" سے مراد مزدلفہ ہے۔ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، پورا میدان عرفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے سوا عرنہ کے، اور پورا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے سوا محسر کے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ وادی محسر کے سوا پورا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا کہ جان لو کہ سوا بطن عرنہ کے سارا میدانِ عرفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے، اور سوا بطن محسر کے سارا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ البتہ میرے نزدیک حاجی کے لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کے لیے مزدلفہ کے قزح نامی مقام پر یا اس کے قریب ٹھہرے، کیونکہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں صبح کی تو آپ مقام قزح میں ٹھہرے اور اپنے پیچھے سواری پر فضل رضی اللہ عنہ کو بٹھایا پھر فرمایا کہ یہ ٹھہرنے کی جگہ ہے، اور سارا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ ابوالحویرث بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ

---

[1] "مشعر حرام" اس مقام کا نام ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ سارے مزدلفہ کو بھی "مشعر حرام" کہتے ہیں۔ تمام اہل علم کے نزدیک اس سے مراد مزدلفہ ہی ہے۔ مکہ معظمہ سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مکہ سے عرفات کا ایک تو سیدھا راستہ ہے، اور ایک ذرا چکر کا ہے۔ عرفات سے مکہ معظمہ واپسی کا حکم اسی دوسرے راستے سے ہے جس میں مزدلفہ پڑتا ہے۔ حاجیوں کے قافلے ۱۰ ذی الحجہ کی ابتدائی رات میں یہاں پہنچ جاتے ہیں اور رات یہیں تہلیل و تسبیح، دعاء و استغفار میں گذارتے ہیں۔

کو مقامِ قزح میں کھڑے دیکھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔
عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ "یہاں سے مکہ تک سارا علاقہ مشعرِ حرام ہے" تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تمام حج کی نشانیاں ہیں، اور مزدلفہ سے مکہ تک کے ایک ایک علاقہ میں حج سے متعلق کوئی نہ کوئی عمل کیا جاتا ہے۔ یہ مطلب آپ کے ارشاد کا نہیں ہے کہ مزدلفہ کا قیام، جو ۱۰ ذی الحجہ کی اول شب سے شروع ہوتا ہے، یہاں سے مکہ تک کیا جا سکتا ہے۔

"وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ" (اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا کہ اس نے تمھیں بتایا ہے، اور یقیناً تم اس سے قبل ناواقفوں میں تھے)۔ یعنی اے مسلمانو! مشعرِ حرام میں اللہ کا ذکر اس کی تعریف اور اس کی نعمتوں کے شکر کے ذریعہ کرو، اور تمہارا یہ ذکر، اللہ کے سامنے خشوع و خضوع، اس کے سامنے جھکنا اور اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے مطابق ہو، ورنہ تم اس سے پہلے شرک اور حیرانی میں مبتلا تھے، حق کا راستہ تمھیں معلوم نہیں تھا، لیکن اللہ نے تمھیں صحیح راستہ بتایا، تم جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے، لیکن اللہ نے تمھیں اس کی آگ سے نجات دی۔ یہ مفہوم ہے "كَمَا هَدَاكُمْ" کا۔ "وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ" کا مفہوم یہ ہے کہ "تم اللہ کی اس ہدایت سے پہلے، جبکہ اس نے تمھیں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا راستہ دکھایا، ناواقفیت میں تھے۔"

"ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ" (پھر تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں) مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ آیت میں "لوگ" سے کون لوگ مراد ہیں، اور یہ کہ کس طرح کی واپسی کے لیے کہا گیا ہے؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خطاب قریش سے ہے، قبیلہ قریش کے لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنے کو "حمس" کہتے تھے، اور حج کے موقع پر دوسرے قبائل کے لوگوں کی طرح عرفات میں جاکر نہیں ٹھہرتے تھے، بلکہ کہتے کہ ہم حرم سے باہر نہیں جائیں گے۔ اسلام میں انھیں بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ جہاں سے لوگ جاکر واپس آتے ہیں تم بھی وہاں جاکر واپس آؤ۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش اور ان کے متبعین اپنے آپ کو حمس کہتے اور (وقوفِ عرفہ کے دن) مزدلفہ میں ہی ٹھہرتے اور کہتے کہ ہم اللہ کے حرم کے باشندے اور اس کے خادم ہیں۔ ان کے سوا دوسرے لوگ اس دن میدانِ عرفہ میں ٹھہرتے تھے، اس لیے انھیں بھی حکم ہوا کہ اور لوگوں کی طرح تم بھی عرفہ میں ٹھہرا کرو اور پھر وہاں سے واپس آیا کرو۔ عروہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے عبدالملک بن مروان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے متعلق، کہ آں حضورؐ نے قبیلہ انصار کے ایک صحابی سے فرمایا تھا کہ میں بھی "حمس" ہوں، لکھا کہ مجھے (سن کر) معلوم نہیں کہ آں حضورؐ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی یا نہیں، البتہ یہ میں نے سنا ہے کہ یہ حدیث آں حضورؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ "حمس" جاہلیت اور شرک کے زمانہ میں قریش کی ملت کو کہتے ہیں، اور قریش کی اولاد خزاعہ اور بنی کنانہ کے قبائل اسمیں شامل ہیں۔ یہ لوگ عرفہ جاکر واپس نہیں آتے تھے، بلکہ مزدلفہ سے ہی (جو حدودِ حرم میں ہے) واپس آجاتے تھے۔ بنو عامر بھی حمس تھے۔ انھیں لوگوں کے متعلق آیت میں ارشاد ہے کہ عرب کے دوسرے قبائل کے لوگوں کی طرح تم بھی عرفہ جاکر واپس آیا کرو۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، عطاء، مجاہد، قتادہ، سدی، ربیع اور عبداللہ بن ابی نجیح رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے کہ عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ ملائکہ کے جلو میں آسمانِ دنیا پر آجاتا ہے اور فرماتا ہے، میرے بندو، میری طرف آؤ، میرے وعدہ پر ایمان لاؤ اور میرے رسول کی تصدیق کرو۔ پھر فرماتا ہے کہ ان کی جزاء کیا ہے؟ عرض

کیا جاتا ہے کہ ان کی جزا یہ ہے کہ آپ انھیں معاف کردیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس زیر تفسیر ارشاد سے یہی مراد ہے کہ "پھر تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہ اللہ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں"۔ قتادہ کی روایت میں ہے کہ قریش کہتے تھے کہ ہم اللہ کے اہل ہیں، اس لیئے اس کے حرم سے باہر نہیں جائینگے ان سے کہا گیا ہے کہ تم بھی حرم سے باہر عرفہ میں جاکر واپس آؤ، کیونکہ یہی ابراہیم واسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔ عبداللہ بن ابی نجیح نے فرمایا کہ معلوم نہیں، حمس کا یہ تصوّر قریش میں ابرہہ کے ہاتھیوں کے واقعہ سے پہلے سے موجود تھا یا بعد میں پیدا ہوا، یہ ان کا اپنا ایک تخیل تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، حرم کے رہنے والے، اس کے متولی اور خادم ہیں، اس لیئے ہمارا مرتبہ اور ہمارا حق تمام عرب سے بڑھ کر ہے، اس لیئے اور عربوں کی طرح ہم حرم سے باہر کی کسی چیز کی عظمت نہیں کرسکتے، کیونکہ قریش بھی اگر ایسا کرنے لگے تو عرب کے دوسرے قبائل حرم کا استخفاف کرنے لگیں گے۔ اسی تصور کے نتیجہ میں انھوں نے عرفہ میں ٹھہرنا اور وہاں سے واپس آنا چھوڑ دیا، حالانکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ وہ بھی "مشاعر حج" میں سے ہے اور دین ابراہیمی کے مطابق ہے۔ اس روایت میں بہت سی بدعتوں کا بھی ذکر ہے جو قریش نے ...... حج کے سلسلے میں ایجاد کی تھیں، اور بہت سی پابندیاں دوسرے عرب قبائل پر عائد کی تھیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "پھر تم وہاں جاکر واپس آؤ" میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے، اور "جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں" سے مراد مزدلفہ ہے، "لوگ" سے اشارہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ہے۔ ضحاک سے روایت ہے کہ مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ لیکن صحیح رائے پہلی ہی ہے، کہ اسی پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ "جو کوئی حج اپنے اوپر لازم کرلے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے، نہ بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا۔ پھر تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بے شک اللہ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں۔ اور تم جو بھی نیک کام کروگے اللہ کو اس کا علم ہوکر رہے گا"۔ اس مفہوم کی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ آیت میں تقدیم ما حقہ التاخیر کے اصول سے کام لیا گیا ہے، یعنی ترتیب میں جو مقدم تھا اسے بیان میں مؤخر کردیا گیا ہے اور جو مؤخر تھا اسے مقدم بیان کیا گیا، کیونکہ آیت "اور تم جو بھی نیک کام کروگے اللہ کو اس کا علم ہوکر رہے گا"، اصل میں بعد کا مضمون ہے، لیکن ایک عربی قاعدہ کے مطابق بیان سب سے پہلے کردیا گیا ہے۔

اگر مفسرین کا پہلے قول پر اتفاق نہ ہوتا تو میں دوسرے قول کو جس کی روایت ضحاک سے ہے، ترجیح دیتا، یعنی یہ کہ "الناس" (لوگ) سے ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ عرفات سے واپسی مزدلفہ سے واپسی اور وہاں اللہ کے ذکر سے پہلے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے عرفات سے واپسی کے ذکر کے بعد اس جگہ سے واپسی کا حکم دیا ہے جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور فرمایا کہ "تم بھی وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں"، ظاہر ہے کہ اس آیت میں عرفات سے واپسی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس مقام (مزدلفہ) سے واپسی کا ذکر ہے جہاں جاکر واپسی ابھی باقی ہے، عرفات سے واپسی کا تو دن بھی گذر چکا، اب وہاں کی واپسی کے حکم کا کیا سوال!۔ (اور عرب جاہلیت کے قریش عرفات جانا اپنے لیئے غیر مناسب سمجھتے تھے)۔ پہلی تفسیر کی بناء پر زیر تفسیر آیت میں بھی عرفات سے ہی واپسی کا حکم ہوگا، حالانکہ یہ حکم گذر چکا ہے، اسے دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم پہلی تفسیر کو مرجوح قرار دیتے، لیکن مفسرین کا اس کی صحت پر اتفاق، اور اس کی تائید میں احادیث کا تواتر

کے ساتھ نقل مانع ہے۔ (اور اسی لیئے ہم نے کہا کہ ان آیات میں تقدیم ماحقہ التاخیر کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ اس قاعدہ کے تحت پہلی تفسیر مضمون و ترتیب آیت کے مطابق ہوجاتی ہے)۔ یہ اعتراض صحیح نہیں ہوگا کہ "الناس" (لوگ) جمع کے لیئے استعمال ہوتا ہے، اور ابراہیم علیہ السلام شخص واحد ہیں، کیونکہ اہل عرب اس طرح کا استعمال کرتے ہیں۔

"وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" ذکر ہو رہا تھا کہ جب عرفات سے منیٰ کی طرف واپس ہونے لگو تو "مشعر حرام" (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت اس طریقہ پر کرو جس طرح اس نے تمھیں سکھایا ہے اور جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کے مطابق ہے، اور پھر ارشاد ہے کہ "اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں"۔ عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عرفہ کے دن (میدان عرفہ میں) میں نے اللہ سے دعا کی کہ میری امت کے گناہوں کو معاف کردے۔ ارشاد ہوا کہ میں نے معاف کیا، سوا ان گناہوں اور مظالم کے جو مخلوق ایک دوسرے پر کرتی ہے۔ میں نے پھر دعا کی لیکن قطعاً قبول نہیں ہوئی پھر مزدلفہ کی صبح کو میں نے دعا کی کہ اے رب! آپ اس پر قادر ہیں کہ مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ اپنی طرف سے دے دیں اور ظالم کو معاف کردیں۔ ارشاد ہوا کہ میں نے یہ بھی معاف کردیا۔ بیان کیا کہ اس پر حضور اکرمؐ مسکرا دیئے۔ ہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! ابھی آپ تبسم فرما رہے تھے، حالانکہ یہ ہنسنے کا دن نہیں ہے۔ آں حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کے دشمن ابلیس پر مجھے ہنسی آگئی، جب اللہ کی قبولیت و مغفرت کو اس نے سنا تو واویلا مچانے لگا اور سر پر مٹی ڈالنے لگا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی حدیث نقل ہے۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد کے سلسلے میں معافی اور مظلوم کو اپنی طرف سے بدلہ دینے کا وعدہ مزدلفہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، اور یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "پھر تم بھی وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بے شک اللہ بڑے بخشنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں"۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کرچکا کرو تو حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (واجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو۔ بلکہ یہ ذکر اس سے

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی

(بدرجہا) بڑھ کر ہو۔ سو بعضے آدمی (جو کافر ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیدیجئے اور ایسے شخص کو

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۞ ۲ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا

آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں

حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞ ۵ اُولٰٓئِكَ

بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچایئے ایسے لوگوں کو

النصف

لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ⑥

(دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا بدولت ان کے عمل کے۔ اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں

اللہ کے نام اور اس کی عظمت کے ذکر سے سماں پیدا کردو

" فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا "، یعنی جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ اور اپنی قربانی ذبح کرلو تو اللہ کی یاد کرو۔ نَسْكًا، نَسِيكَةً، مَنْسَكًا، قربانی ذبح کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، بولتے ہیں " نَسَكَ الرَّجُلُ " یعنی مرد نے اپنی قربانی ذبح کردی۔ " مَنْسَكٌ "۔ مشرق، مغرب کی طرح اسم ہے۔ ہم نے " مَنْسَكٌ " کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ مفسرین سے نقل ہے، مجاہد نے " فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ " کی تفسیر میں فرمایا کہ مراد " قربانی کرنا " ہے۔

" فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا "، کی تفسیر کئی طرح کی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عرب حج سے فارغ ہونے کے بعد ایک جگہ جمع ہو جاتے اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر بیان کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ یہ جاہلی طریقہ تھا، اب اسلام میں ثنا، ذکر اور تعظیم صرف اپنے رب کی کرو، اور خوب کرو، جس طرح جاہلیت میں تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے اب اسی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، اللہ کا ذکر کرو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ عرب حج کے موقعہ پر اپنے آباء و اجداد کے مفاخر بیان کیا کرتے تھے۔ کوئی کہتا کہ میرے باپ کا دسترخوان بہت وسیع تھا، کوئی کہتا، میرا باپ شمشیر زنی میں ماہر تھا اور کوئی کہتا کہ میرے باپ نے فلاں قبیلہ کے سر کا بھیجا نکال لیا تھا۔ یہ تفسیر مجاہد، ابو وائل، ابوبکر بن عیاش، قتادہ اور عکرمہ رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ " پس تم اللہ کو یاد کرو جیسے نوعمر بچے اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں "۔ عطاء، ضحاک، ربیع اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ تفسیر منقول ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ " تم اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ کو یاد کرتے ہو "۔ اس تفسیر میں کہا گیا ہے کہ عرب جاہلیت میں مشرکین حج کے اعمال پورے کرنے کے بعد منیٰ میں کھڑے ہو کر اللہ سے دعائیں کرتے تھے، اور دعا میں صرف اپنے باپ کا حوالہ دیتے تھے، دعا کے الفاظ کچھ یوں ہوتے کہ " اے اللہ! میرا باپ بڑا بہادر، بڑا مالدار اور بڑے گروہ کا سردار تھا، مجھے بھی ایسا ہی بنا دے "۔ ارشاد ہے کہ دنیا کی طلب اور اپنے باپ دادا کا ذکر چھوڑ کر صرف اللہ کا ذکر کرو۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حج سے فراغت کے بعد مؤمن بندوں کو طاعت و خضوع کے ساتھ اپنے ذکر کا حکم دیا ہے، اس ذکر سے ممکن ہے وہی تکبیر و ذکر مراد ہو جس کا تذکرہ آیت " پس اللہ کا ذکر چند گنے ہوئے دنوں میں کرو " میں ہے۔ اس آیت میں بھی اعمالِ حج سے فراغت کے بعد ذکر اللہ کا حکم ہے۔ اس پر ان کی ترغیب بیٹے کے باپ کے ذکر کی مثال سے دی، کہ جس طرح بیٹے اپنے باپ کا تذکرہ کرتے ہیں، اور جس کثرت سے کرتے ہیں اسی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تم اللہ کا ذکر کرو۔ اس تمثیل میں تضرع اور

سپردگی کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے، یعنی جس طرح بچہ اپنے ماں باپ کے سامنے تضرع وزاری کرتا ہے تم اللہ کے حضور میں اس سے بھی زیادہ کرو، کیونکہ انھیں اور ان کے آباء واجداد کو جو بھی نعمتیں میسر ہیں وہ سب اللہ کے فضل سے ہیں اور وہی ان کا مالک ہے۔ ہم نے اس رائے کو ممکنہ حد تک ترجیح اس لیے دی ہے کہ اعمالِ حج سے فراغت کے بعد اس تکبیر وذکر کے سوا جو اللہ تعالیٰ نے منیٰ کے لیے خاص کیا ہے، اور کوئی ذکر باقی نہیں رہتا۔

"فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ"، یعنی اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ کرو جتنا اولاد اپنے باپ دادا کا کرتی ہے، اور آخرت اور دنیا کی بھلائیوں کے لیے اللہ ہی کی طرف رجوع کرو، اور اپنے تمام اعمال صرف اسی کی رضا جوئی کے مقصد سے کرو، اور کہا کرو کہ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے میں خریدی، اور ان کے تمام اعمال دنیا اور اس کی آرائش وزیبائش کی طلب کے لیے وقف ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رب سے دنیا کے سوا اور کچھ نہیں مانگتے، ایسے لوگوں کا آخرت کی ان نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں جو اللہ نے اپنے اولیاء کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔ ابو وائل نے فرمایا کہ مراد وہ لوگ ہیں جو صرف طلب دنیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ، ہمیں بھیڑ، بکری دے، ہمیں اونٹ دے، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اس طرح کی دعا، جاہلیت میں مشرکین کیا کرتے تھے۔ ابو بکر بن عیاش کی روایت میں ہے کہ مشرکین عرب اعمالِ حج سے فراغت کے بعد اس طرح کی دعائیں کرتے تھے کہ اے اللہ! ہمیں بکری دے، ہمیں اونٹ دے۔ اس کے متعلق آیت نازل ہوئی۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عرب بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے تھے اور دعا، یہ کرتے تھے کہ اے اللہ! بارش برسا، ہمارے دشمن پر فتح عطا فرما۔ مجاہد، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی اسی کے مطابق تفسیر نقل ہے۔ سدی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ مشرکین منیٰ میں کھڑے ہو کر اس طرح کی دعائیں کرتے تھے۔ ابن زید کی روایت میں ہے کہ اس وقت تین گروہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی موجود تھی، دوسری طرف کفار تھے، اور تیسری طرف منافقین۔ زیر تفسیر آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنھیں صرف دنیا مطلوب تھی، نہ آخرت کی فلاح وہ مانگتے تھے اور نہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ ایک جماعت وہ تھی جس کے متعلق اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے کہ وہ کہتی تھی کہ "اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری دے اور آخرت میں بھی بہتری، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا" اور تیسری جماعت ان لوگوں کی تھی جن کے متعلق ایک اور موقعہ پر ارشاد ہے کہ "انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی بات دنیا کی زندگی کے بارے میں آپ کو اچھی معلوم ہوئی، لیکن وہ شدید ترین دشمن ہے" (یعنی منافقین)۔ "خَلَاق" کے مفہوم کے سلسلے میں تفصیلی بحث ہم کر چکے ہیں، اور اپنی اس رائے کو بھی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ لفظ "حصہ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ "حَسَنَة" سے مراد کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد عافیت ہے، یعنی "لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں عافیت عطا فرما اور آخرت میں عافیت عطا فرما، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچانا"۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب یہ دعا، کرتے تھے کہ اے اللہ!

آخرت میں آپ کو جو کچھ بھی مجھے سزا دینی ہو وہ دنیا ہی میں دے لیجئے (اور عذاب آخرت سے محفوظ رکھیے)۔ چنانچہ وہ صاحب شدید مرض میں مبتلا ہو کر صاحب فراش ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ان کا تذکرہ کیا تو آں حضورؐ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ آں حضورؐ سے عرض کی گئی کہ یہ صاحب اس طرح کی دعا کیا کرتے تھے، آں حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کی سزا کو برداشت کرنے کی کسی میں بھی طاقت نہیں، اس کے بجائے تم یہ دعا کیا کرو کہ "اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی عافیت دے اور آخرت میں بھی عافیت، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا"۔ اب وہ صاحب یہ دعا کرنے لگے، اور چند ہی دنوں میں صحتیاب ہوئے۔ قتادہ نے فرمایا کہ "حَسَنَةً" سے مراد عافیت ہے۔ یہ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں "حَسَنَةً" سے مراد دنیا میں "علم و عبادت" ہے، اور آخرت میں "جنت" ہے۔ حسن اور سفیان ثوری رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے دنیا میں "علم اور پاک روزی" منقول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "حَسَنَةً" سے دنیا میں "مال" اور آخرت میں "جنت" مراد ہے۔ ابن زید اور سدّی سے بھی نقل ہے۔

میری رائے میں صحیح تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے گھر کا حج کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت میں "حَسَنَةً" مانگتے ہیں۔ یہ ایک وسیع لفظ ہے، جس میں جسمانی اور معاشی عافیت، روزی اور علم و عبادت سب ہی آجاتے ہیں۔ جہاں تک آخرت میں "حَسَنَةً" کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد جنت ہے، کہ اس دن جسے جنت نہیں ملی وہ تمام حسنات سے محروم رہا اور عافیت کا اس کے قریب سے بھی گذر نہیں ہوا۔ ہم نے یہ تفسیر اس لیے پسند کی کہ اللہ تعالیٰ نے "حَسَنَةً" کو عام رکھا ہے اور کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی، پھر ہم اس میں کس بنیاد پر کوئی تخصیص کریں!۔ "وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ "اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا"۔ بولتے ہیں "وَقَيْتُهُ كَذَا" "میں نے اسے فلاں چیز سے بچا لیا"۔ "وَقَاكَ اللّٰهُ" "تمھیں اللہ تکلیف اور پریشانی سے محفوظ رکھے"۔

"أُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ" "یہی وہ لوگ ہیں جنھیں حصہ مل کر رہیگا اس کے بدلہ میں جو انھوں نے عمل کر رکھا ہے، اور اللہ حساب بہت جلد لے لے گا"۔ "أُولٰٓئِكَ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اعمال حج کو مکمل کرنے کے بعد یہ دعا کرتے ہیں کہ "اے اللہ ہمیں دنیا میں بھی بہتری و بھلائی عنایت فرمائیے اور آخرت میں بھی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچانا"۔ کیونکہ ان کی تمام تر امیدیں اور آرزوئیں اللہ تعالیٰ سے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ تمام خیر اللہ ہی کے پاس سے ملتی ہے اور سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے جو چاہتا ہے دیتا ہے۔ ارشاد ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں حج اور اس کے مناسک کی ادائیگی پر بھرپور ثواب ملے گا، کہ یہ عمل انھوں نے اپنا مال خرچ کرکے اور اپنی جسمانی توانائیاں صرف کرکے انجام دیا ہے، لیکن ان کے مقابل وہ لوگ جو یہ سب کچھ خالص اللہ کے لیے، اس کے ثواب کی امید پر نہیں کرتے، بلکہ ان کے پیش نظر صرف دنیا اور اس کے فوائد ہوتے ہیں تو وہ نامراد و ناکام ہیں اور انھیں اللہ کے یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ تفسیر قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے نقل ہے۔ "وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ" کا مطلب یہ ہے کہ اوپر مذکور دونوں فریق کے اعمال اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، دونوں کے مقاصد

اور نیتوں سے وہ خوب واقف ہے، "وہ دونوں کا حساب بہت جلد لے لے گا" اور پھر دونوں کو ان کے عمل و نیت کے مطابق بدلہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "جلد حساب لینے والا" ذکر کی، کیونکہ اللہ کے سامنے دنیا و مافیہا کے ہر ہر جزئیہ کی تفصیلات ہیں، مخلوق کی طرح اس کے لیئے اسے شمار کرنے، سوچنے اور دیکھنے کی ضرورت نہیں، اس سے دنیا اور آسمان کی کوئی چیز چھپی نہیں، اور وہ اپنے اسی لامحدود علم کے مطابق بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اسی لیئے اپنی صفت "سَرِیْعُ الْحِسَابِ" بیان کی اور بندوں کو بتایا کہ اس میں بھی اس کی کوئی نظیر و مثل نہیں، وہ پلک جھپکتے ہی سب کے حساب چکا دے گا، اسے اس کے لیئے کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ

اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک۔ پھر جو شخص دو دن میں (مکہ واپس آنے میں)

يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ

تعجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں

لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

اس شخص کے واسطے جو (خدا سے) ڈرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے

اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

پاس جمع ہونا ہے۔

ایامِ حج میں اللہ کا ذکر

"وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ" یعنی اللہ کی یاد اس کی توحید و عظمت کے ساتھ، چند گنے ہوئے دنوں میں کرتے رہو۔ مراد منیٰ[1] میں رمی جمار (کنکری پھینکنے) کے دن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دنوں میں اپنے بندوں کو نمازوں کے بعد تکبیر کا حکم دیا ہے، اسی طرح کنکری پھینکتے وقت، ہر کنکری پر تکبیر کا حکم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتوں میں یہی قول نقل ہوا ہے کہ مراد ایام تشریق، قربانی کے دن کے بعد تین دن ہیں۔ عطاء بن ابی رباح، مجاہد، ابراہیم، حسن، اسماعیل بن ابی خالد، قتادہ، سدی، ربیع، مالک، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی یہ قول نقل ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ "ایام معدودات" سے مراد ایام تشریق

[1] منیٰ مکہ معظمہ سے شمال مغرب میں چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ایام تشریق ۱۰ر، ۱۱ر، ۱۲ر ذی الحجہ کو کہتے ہیں۔ عرفات اور مزدلفہ سے واپسی میں صبح کو حاجیوں کے قافلے یہاں پہونچتے ہیں اور ۱۲ر کی شام تک تو بہرحال یہیں قیام رہتا ہے۔ حج کے متعدد واجبات، سنن و مستحبات یہاں انجام پاتے ہیں، مثلاً قربانی، سر کے بال اتروانا، کنکریاں مارنا، احرام کھولنا۔ علماء نے اس پر صحابہ و تابعین کا اتفاق نقل کیا ہے کہ "ایام معدودات" سے مراد ایام تشریق ہی ہیں۔

ہیں، اور "ایام معلومات" سے مراد عرفہ اور قربانی کے دن اور ایام تشریق سب ہیں۔

ہماری اس تفسیر کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس کی متعدد اور مسلسل روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی دن "اللہ کے ذکر کے دن" ہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو منیٰ میں یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا کہ "ان دنوں میں کوئی روزہ نہ رکھے، کہ یہ کھانے پینے اور اللہ عزوجل کے ذکر کے دن ہیں"۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس مضمون کی حدیث مروی ہے۔ مسعود بن حکم زرقی اپنی والدہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا، گویا میں علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ رہی ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کے سفید خچر پر سوار چلے آرہے ہیں، آپ نے اپنی سواری شعب انصار کے پاس لاکر روک دی اور اعلان کیا کہ اے لوگو! یہ دن روزے کے دن نہیں ہیں، یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔ اگرچہ حضور اکرم ﷺ سے اس کی صراحت نہیں نقل ہے کہ یہ وہی "ایام معدودات" (گنے چنے دن) ہیں جن کا ذکر زیر تفسیر آیت میں ہوا ہے، اس لیے یہ شبہ ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ حدیث سے اشارہ "ایام معلومات" (معلوم و متعین دن) کی طرف کیوں نہ لیا جائے، کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر اللہ کا حکم دیا ہے! لیکن حدیث کو "ایام معلومات" کی تشریح قرار دینا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ ایام معلومات میں ذکر کا بیان قرآن مجید میں جس تفصیل سے آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس "ذکر" سے مراد چوپایوں، قربانی کے جانوروں پر اللہ کا ذکر کرنا، ان کی قربانی کرتے وقت، ہے۔ ارشاد ہے کہ "لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ" (تاکہ اپنے فوائد کے لیے آموجود ہوں اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیے ہیں) —————— اس آیت میں ایک خصوصیت اور شرط کے ساتھ اللہ کے ذکر کا حکم ہے، لیکن زیر تفسیر آیت میں اس کے برخلاف حکم عام ہے، اور حدیث میں بھی ذکر اللہ کا عام ہی حکم ہے۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اس کے بجائے "ایام معلومات" کی طرف ہوتا تو آپ بھی حدیث میں شرط کا ذکر ضرور کرتے جو آیت میں مذکور ہے۔

"فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ" (پس جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں) اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ "پس اگر کوئی شخص دو ہی دن میں (۱۱ ذی الحجہ کو منیٰ میں پہنچ کر ۱۲ کو) واپس چلا آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو دو ہی دن میں واپس نہ آجائے، بلکہ تین دن میں (۱۳ ذی الحجہ کو) واپس آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ عطاء، حسن، عکرمہ، مجاہد، سدی، قتادہ، ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کی روایت ہے۔ ایک قول یہ بھی آیت کی تفسیر میں نقل ہے کہ "جو کوئی دو دنوں میں ہی جلدی کرے اسے معاف کر دیا جاتا ہے اور اس لیے اس پر اس کا کوئی گناہ نہیں، اور اسی طرح اسے بھی معاف کر دیا جاتا ہے جو تاخیر کرے"۔ عبداللہ بن مسعود، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابراہیم، مجاہد اور معاویہ بن قرہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کا ایک یہ مفہوم بھی نقل ہے کہ آئندہ سال تک اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، اس کے بجائے ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے تو اس حج کے بعد تمام عمر اس پر کوئی گناہ نہیں، ایسے شخص کے تمام گناہ معاف

ہو جاتے ہیں۔ اس کی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ، ابن زید اور سدّی سے ہے۔ ابن جریج نے بیان کیا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس کے بعد ہے کہ "لِمَنِ اتَّقَى اللّٰہَ" "(یہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتا رہے)
آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ "جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے تو اس کے اس جلدی واپس آجانے میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ تیسرے دن کے ختم تک شکار مارنے سے پرہیز کرتا رہے، اور جو تاخیر کرے اور تیسرے دن واپس آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور محمد بن ابی صالح سے اس تفسیر کی روایت ہے۔ ایک اور تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ آیت میں مذکورہ صورت میں کوئی گناہ نہیں، یعنی یہ معاف ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ حج میں ان اعمال سے پرہیز کرتا رہا، جن سے اللہ نے روکا ہے، اور اللہ سے ڈرتا رہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حج میں جس نے پرہیز گاری اور تقویٰ اختیار کیا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

ان تمام اقوال میں راجح تفسیر یہ ہے کہ "جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے، یعنی منیٰ کے سہ روزہ قیام میں دو ہی دن میں واپس آگیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یعنی اگر وہ حج میں اللہ سے ڈرتا رہا اور ان تمام اُمور سے پرہیز کیا جن سے پرہیز کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور وہ تمام اعمال پورے آداب وحدود کے ساتھ بجا لایا جن کے بجا لانے کا اللہ نے حکم دیا ہے تو اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا۔ اسی طرح جو تیسرے دن واپس آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اگر اس نے تقویٰ و پرہیز گاری کے ساتھ حج کیا ہے تو اللہ اس کے بھی تمام گناہ معاف کر دے گا۔" ہم نے یہ تفسیر اس لیے پسند کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں، جن کی روایات بتواتر ہم تک پہنچی ہیں، یہ ارشاد موجود ہے کہ "جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا، اور اس میں نہ فحش کلامی کی اور نہ بے حکمی کی تو وہ اپنے گناہوں سے نومولود بچے کی طرح پاک ہو جاتا ہے"، اور یہ کہ "حج وعمرہ مسلسل کرتے رہو، کیونکہ ان سے گناہ اس طرح چھٹ جاتے ہیں جیسے بھٹی سے لوہے، سونے اور چاندی کا میل چھٹ جاتا ہے۔" عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حج اور عمرہ مسلسل کرتے رہو کیونکہ یہ محتاجی اور گناہ کو دور کر دیتے ہیں، جیسے بھٹی میں پڑ کر لوہے، سونے اور چاندی کا میل دور ہو جاتا ہے، اور مبرور و مقبول حج کا جنت سے کم کوئی ثواب نہیں۔" عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی حدیث نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلعم نے فرمایا، جب تم نے حج پورا کر لیا تو نومولود بچے کی طرح گناہ سے پاک ہو گئے۔ اس مضمون کی احادیث بکثرت ہیں، ہم ان سب کو یہاں ذکر کر کے بحث کو طول دینا نہیں چاہتے۔ ان تمام احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس نے حج کیا اور اس کی ادائیگی ان تمام حدود و آداب کے ساتھ کی جن کا اللہ نے حکم دیا ہے تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہے کہ "فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى" "یعنی جو اپنے حج میں اللہ سے ڈرتا رہا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ" یعنی اے مؤمنو! اللہ نے جو امور تم پر فرض کیے ہیں ان میں کمی زیادتی کرنے، جن سے اس نے تمھیں حج میں روکا ہے ان کا ارتکاب کرنے اور جن کا حکم دیا ہے انھیں نہ بجا لانے میں "اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے"، اور اس وقت وہ تمھیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ

اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزے دار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ

اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۸ وَاِذَا تَوَلّٰى

کو حاضر ناظر بتاتا ہے اپنے مافی الضمیر پر حالانکہ وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے اور جب پیٹھ پھیرتا ہے

سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ

تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور (کسی کے) کھیت یا مواشی کو تلف کر دے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۹ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ

اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ خدا کا خوف کر تو نخوت اس کو گناہ پر (دونا)

بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۰ وَمِنَ

آمادہ کر دیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بُرا ہی ٹھکانہ ہے اور بعضا

النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ

آدمی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۱۱

اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں

طبقہ منافقین کا ذکر

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ" اب منافقین کی صفات بیان ہو رہی ہیں، ارشاد ہے کہ "اے محمدؐ، بعض ایسے بھی ہیں جن کی گفتگو اور بظاہر آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے، اور جو ان کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ شدید ترین دشمن ہیں"۔ مفسرین کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ بعض مفسرین کی رائے ہے کہ اخنس بن شریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی، یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام کا اظہار کرتے ہوئے آیا اور قسم کھا کھا کر کہا کہ آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن واپسی میں مسلمانوں کے مال و جائداد کو تباہ کرتا ہوا گیا۔ سُدی بیان کرتے ہیں کہ یہ شخص حضور اکرمؐ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا اور اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضور اکرمؐ کو اس کی باتیں بہت پسند آئیں۔ اس نے کہا کہ میرا مقصد اسلام کے سوا اور کچھ نہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں صرف اسی غرض سے آیا ہوں۔ اسی کے متعلق آیت میں ارشاد ہے کہ "اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بناتا ہے"۔ پھر جب واپس ہوا تو مسلمانوں کے ایک کھیت سے، جہاں گدھے بھی تھے، گذرتے ہوئے کھیتی

کو جلادیا اور گدھوں کی نسیں کاٹ دیں۔ اسی کا بیان اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ "اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے اور کھیتی اور نسل کو تلف کرے۔" "اَلَدُّ الْخِصَامِ" یعنی شدید ترین دشمن۔ اسی سلسلہ میں آیات "وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ" اور "وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ" بھی نازل ہوئیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، جنھوں نے اپنی نجی مجلس میں غزوۂ رجیع پر نکتہ چینی کی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خبیب رضی اللہ عنہ کے ساتھی مکہ اور مدینہ کے درمیان مقامِ رجیع میں شہید کردیئے گئے تو بعض منافقین نے کہا کہ ان مقتولوں کا معاملہ بھی قابلِ افسوس ہے، ان سے اپنے گھروں میں بھی نہ بیٹھا گیا اور نہ اپنے ساتھی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام ہی پہنچا سکے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی باتیں آپ کو دنیاوی زندگی کے سلسلے میں اچھی معلوم ہوتی ہیں، وہ آپ کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ شدید ترین دشمن ہیں، اور زمین پر فساد پھیلاتے پھرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے اپنی جانوں کو بیچ دیا ہے انھوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہاں تک کہ شہادت پائی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مراد تمام منافقین ہیں، اور آیت میں ان کے ظاہر و باطن کے اختلاف کو بتایا گیا ہے۔ محمد بن کعب اور سعید مقبری رحمہما اللہ آپس میں بعض مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ سعیدؒ نے فرمایا کہ بعض آسمانی کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کی زبانیں شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہیں، لیکن ان کے دل ایلوے سے زیادہ کڑوے ہیں، عوام کے لیئے انھوں نے نرمی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے لیکن وہ دین کے بدلے میں دنیا کے خریدار ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے متعلق ارشاد ہے کیا یہ لوگ مجھ پر جرءت کرتے ہیں، اور میرے ساتھ دھوکا کرتے ہیں! میری عزت کی قسم میں ان پر ایک ایسا فتنہ بھیجوں گا کہ ان میں کا نہایت بردبار اور متحمل المزاج بھی آتش زیر پا ہوجائے گا۔ محمد بن کعبؒ نے اس پر کہا کہ یہ تو قرآن مجید میں بھی ہے۔ سعید نے پوچھا کہ قرآن مجید کی کس آیت میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے؟ تو آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ سعیدؒ نے فرمایا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ آیت کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی! محمد بن کعبؒ نے فرمایا کہ آیت اگرچہ نازل خاص واقعہ اور خاص شخص کے بارے میں ہو، لیکن اس کا حکم عام ہوتا ہے۔ نوف جو پچھلی امتوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، ان سے سعید قرظی کا اسی مضمون کا ایک مذاکرہ دوسری روایت میں نقل ہوا ہے۔ قتادہ، مجاہد، ربیع اور عطاء رحمہم اللہ سے بھی یہی نقل ہے کہ آیت سے مراد منافقین ہیں۔ ربیعؒ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا، عمل اس کے بہت بُرے تھے، لیکن زبان میں بڑی مٹھاس تھی اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ "وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ" کی قراءت دو طرح کی گئی ہے ایک تو یہی عام اور مشہور قراءت (اللہ کے فتحہ کے ساتھ)، یعنی منافق اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ بناتا ہے کہ وہ جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہی اس کے دل میں بھی ہے، اور یہ کہ وہ واقعی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے، حالانکہ وہ جھوٹا ہے۔ ابن زید نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور کہتا کہ اے اللہ کے رسول، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے پاس سے حق اور سچائی لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ حضور اکرمؐ اس کی ان باتوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے۔ وہ شخص یہ بھی کہتا کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، یا رسول اللہ!

خدا کی قسم، جو کچھ میں زبان سے کہتا ہوں وہی میرے دل میں ہے۔ بیان کیا کہ اس طرح کی باتیں کرنے والے منافقین تھے۔ آپ نے اس کے ثبوت میں یہ آیت پڑھی "جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں" یعنی جو یہ اللہ کو گواہ بناتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس دعوے میں یہ جھوٹے ہیں۔ سدی نے "وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ" کی تفسیر میں بھی یہی فرمایا کہ "وہ کہتے تھے کہ اللہ جانتا ہے کہ ہم سچے ہیں، ہمارا مقصد صرف اسلام ہے" مجاہد سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔

دوسری قراءت اس کی یہ ہے کہ "وَيَشْهَدُ اللّٰهُ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ" "اللہ کے ضمہ کے ساتھ" یعنی اللہ گواہی دیتا ہے اس کی جو ان کے دل میں نفاق چھپا ہوا ہے، اور یہ کہ زبان سے یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دل کی بات کے بالکل مخالف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر بھی اسی قراءت کی بنیاد پر ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک صحیح قراءت پہلی ہی ہے، کیونکہ اسی پر سب کا اتفاق ہے۔

"وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ" "اَلَدُّ" سخت حجت باز شخص کو کہتے ہیں۔ لغت عرب سے یہی معنی ثابت ہے۔ مفسرین کے اس کی تفسیر کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ ایک تفسیر میں اس کا مفہوم "جھگڑالو" بتایا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے" یعنی گفتگو میں معمولی باتوں پر جھگڑے لڑائی پر اتر آتا ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ "اللہ کی معصیت میں سخت دل، ناحق پر جھگڑنے والا، دیکھنے میں بڑا چرب زبان، لیکن عمل میں نرا جاہل، باتیں حکمت آمیز کرتا ہے لیکن خود ہمیشہ غلط روش اختیار کرتا ہے" دوسری تفسیر یہ ہے کہ بحث میں کبھی سلیم الطبعی کا ثبوت نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ کج روی اختیار کرتا ہے۔ مجاہد اور سدی رحمہما اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ لیکن ان دونوں تفسیروں کا منشاء و مقصد ایک ہی ہے، کیونکہ کج روی ہی کو جھگڑالو پن کا پیش خیمہ ہے۔

ایک قول اس کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ "حالانکہ وہ جھوٹا ہے" چنانچہ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اَلَدُّ الْخِصَامِ" بمعنی کاذب "(جھوٹا)" ہے۔ لفظ کا یہ اصل مفہوم تو نہیں ہے، لیکن غالباً اس نقطۂ نظر سے یہ تفسیر کی گئی ہے کہ آیت کا مقصد یہی ہے۔ "خِصَامِ" مصدر ہے، جھگڑا اور دشمنی کے معنی میں۔ آیت میں منافقین کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ منافق کی باتیں آپ کو بھی اچھی معلوم ہوتی ہیں، اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بھی بناتا ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے وہی کہہ رہا ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی چرب زبانی ہے، باطل اور جھوٹ کو صحیح ثابت کرنے کا فن اسے خوب آتا ہے۔

"وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا" "یعنی اے محمد! یہی منافق جب پیٹھ پھیرتا ہے، آپ کے یہاں سے واپس جاتا ہے (تو اس دوڑ دھوپ میں لگ جاتا ہے کہ زمین پر فساد کرے)۔ "تَوَلّٰى" کا یہی مفہوم یعنی جب آپ کے یہاں سے واپس جاتا ہے" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ لیکن بعض حضرات نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ "جب وہ غصہ ہوتا ہے" ابن جریج سے یہ مفہوم نقل ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "جب یہ منافق آپ کے پاس سے غصہ ہو کر نکلتا ہے تو زمین پر فساد کرتا ہے اور وہ اعمال کرتا ہے جو اللہ نے حرام کیے ہیں، جیسا کہ ہم نے سدی کا قول بیان کیا تھا کہ اخنس بن شریق ثقفی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس نے بظاہر اسلام کا اظہار کیا تھا، لیکن مسلمانوں کے کھیت تباہ کر ڈالے تھے اور ان کے گدھے مار ڈالے تھے" "سعی"

کلامِ عرب میں "عمل" کے معنی میں آتا ہے، یعنی کسی کام کے لیے کوشش اور دوڑ دھوپ تاکہ اس کا پھل اسے ملے، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔

آیت میں مذکور منافق کی طرف منسوب جس فساد کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اس کی تفصیل میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں ایک قول تو وہی ہے جو ہم پہلے اخنس بن شریق کے طرزِ عمل کے سلسلے میں بیان کر چکے ہیں، یعنی ڈاکہ زنی اور راستہ میں خوف وہراس پیدا کرنا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "زمین پر فساد" سے مراد صلہ رحمی نہ کرنا اور مسلمانوں کا خون بہانا ہے۔ یہ قول ابنِ جریج سے نقل ہے۔ لیکن آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس منافق کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے واپس جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے"۔ اس میں تمام ہی گناہ آجاتے ہیں، کیونکہ اللہ کی نافرمانی زمین پر فساد کے مرادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس "زمین پر فساد" کی کوئی خاص صورت نہیں بیان کی ہے، اس لیے ڈاکہ زنی اور راستہ کو غیر محفوظ بنانا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اس کے علاوہ دوسرے تمام گناہ بھی اس میں داخل ہیں۔ البتہ زیرِ تفسیر آیت میں، سیاق وسباق سے زیادہ قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد ڈاکہ زنی، اور راستہ کو غیر محفوظ بنا دینا ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ "اور کھیتی اور نسل کو تلف کرے"۔ یہی ڈاکہ زنی ہے۔

"وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ" (اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے) یہ منافق کھیتی اور نسل کو کس طرح "ہلاک" کرتا ہے؟ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کی صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے کھیتوں کو اس نے جلا ڈالا تھا اور ان کے گدھے کاٹ ڈالے تھے۔ اس کی سدیؒ سے روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ "جب یہ منافق پیٹھ پھیرتا ہے تو ظلم اور سرکشی کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش روک لیتا ہے اور "کھیتی اور نسل ہلاک ہو جاتی ہے"۔ مجاہد نے ثبوت میں اس آیت کی تلاوت کی "فساد بر و بحر میں پھیل پڑا ہے، ان اعمال کی وجہ سے جو لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے کمائے، تاکہ اللہ انھیں ان کے بعض اعمال کا بدلہ دے، تاکہ وہ باز آجائیں"۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "خدا گواہ ہے، بحر (سمندر) سے مراد اس کا معروف ومشہور مفہوم ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ہر وہ گاؤں بھی ہے جو کسی بہتے ہوئے نالے کے کنارے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی اس تفسیر کے لیے اگرچہ آیت میں گنجائش ضرور ہے، لیکن صحیح تفسیر وہی ہے جو سُدّی رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے نقل کی۔ "اَلْحَرْثُ" سے مراد کھیتی ہے، اور "اَلنَّسْلُ" سے مراد نسل، بعد میں آنے والی اولاد ہے۔ "کھیتی کی ہلاکت" سے مراد اسے جلا دینا ہے۔ "نسل کی ہلاکت" سے مراد یہ ہے کہ جن سے نسل چلتی ہے یعنی ماں، باپ۔ نر، مادہ انھیں مار ڈالتا ہے۔

ہماری رائے میں راجح تفسیر سدّی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، البتہ انھوں نے اپنی تفسیر میں ایک خاص واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک منافق نے مسلمانوں کے گدھے مار ڈالے تھے اور ان کی کھیتی جلا ڈالی تھی۔ ایسا ہی ہوگا، لیکن اس میں کیا حرج ہے کہ آیت کا مفہوم عام رکھا جائے، یعنی جو بھی کھیتوں کو جلاتا ہے اور نسل کشی کا مرتکب ہے وہ اس کے حکم میں داخل ہے اللہ تعالیٰ نے بھی آیت کے الفاظ عام ہی رکھے ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس میں کسی خاص واقعہ کی وجہ سے تنگی کی جائے ہماری اس رائے کی تائید مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے اقوال سے ہوتی ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

”حَرْث“ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جنھیں ہم بوتے ہیں اور ”نَسْل“ سے مراد ہر طرح کے چوپایہ کی نسل ہے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ نسل میں صرف چوپائے اور جانور ہی نہیں آتے، بلکہ انسان بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس مضمون کی روایت ضحاک، ربیع، عطاء اور سعید بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی ہے۔ ”وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ“ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔“ فساد سے مراد معصیت، ڈاکہ زنی اور راستہ کو غیر مامون بنا دینا ہے۔ ”فَسَادَ“ مصدر ہے۔

”وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ“، اسی منافق کا ذکر ہے جس کے اوصاف ابھی بیان ہوئے یعنی ”جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر اور زمین پر فساد کرنا بند کردے تو اس کی نخوت وغرور اسے اللہ کی معصیت اور نافرمانی پر اور زیادہ آمادہ کر دیتا ہے، اور وہ بڑھ چڑھ کر فساد پھیلانے لگ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی اس گمراہی کے بدلے میں اس کے لیے جہنم ہی بس ہے، اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت سے مراد ہر منافق و فاسق ہے (جو مخلصانہ نصیحت پر اور زیادہ آمادۂ نافرمانی ہو جاتا ہے)، یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی ان صالحین کا تذکرہ ہے جو اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتے ہیں یعنی جب اس گروہ کا کوئی شخص کسی منافق کو نصیحت کرتا ہے، اور اس کی معقول نصیحت منافق کو اور زیادہ آمادۂ نافرمانی کر دیتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی جان بھی اللہ کی رضا جوئی کے لیے بیچ دی ہے، چنانچہ وہ اس معاملہ میں لڑ مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ تفسیر علی، عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل ہے۔ آیت کی دوسری تفسیر وہی ہے جس کی تفصیل اس سے پہلے آ چکی ہے کہ مراد اخنس بن شریق منافق ہے۔ ”وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ“ یعنی جہنم کیا ہی بری آرام گاہ ہے جس کی وعید اللہ تعالیٰ نے اس منافق کو دی ہے۔

اور جو رضائے الٰہی کے طالب ہیں

”وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ“ یعنی ”اور کوئی ایسا بھی ہے جو اپنی جان تک اس کے عوض میں بیچ دیتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے“ یہی مضمون ایک موقعہ پر یوں بیان ہوا ہے ”بلا شبہ اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور ان کے مال اس عوض میں خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے“۔ ”اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ“ یعنی ”اللہ کی رضا جوئی میں“، یعنی یہ بیچنے والا اپنے آپ کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے بیچ ڈالتا ہے۔

آیت کے شانِ نزول کے بارے میں مفسرین سے مختلف اقوال نقل ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آیت مہاجرین اور انصار کے بارے میں نازل ہوئی، اور آیت سے مراد اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہیں۔ عکرمہ سے روایت ہے کہ آیت صہیب بن سنان اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو آپ کے گھر والوں نے پکڑ لیا تو آپ بھاگ کر آں حضور کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پھر جب آپؓ ہجرت کے ارادہ سے نکلے تو راستہ میں مرالظہران کے مقام پر جہاں آپؓ کے قبیلہ کا قیام تھا، انھوں نے آپ کو پھر روکنا چاہا، لیکن آپ نے وہاں بھی ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ صہیب رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر والوں نے پکڑ لیا اور قید کر دیا۔ لیکن آپ نے اپنا بہت سا مال انھیں دیکر اپنے کو آزاد کرایا۔ جب آپ ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو راستہ میں منقذ بن عمیر نے آپ کو پکڑ لیا، اور جو کچھ مال واسباب باقی رہ گیا تھا وہ بھی اس کے حوالہ کر دینا پڑا اور اس طرح اس سے اپنے آپ کو آزاد کرایا۔ ربیع سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے کہ ایک مہاجر کو ہجرت کرتے وقت اسی طرح کے مصائب سے جن میں ان کا تمام مال واسباب چھن گیا تھا دوچار ہونا پڑا تھا، اور انھیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اللہ کی طاعت، اس کے راستے میں جہاد اور امر بالمعروف میں اپنی جان تک کی پروا نہ کرے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر بھیجا۔ مسلمانوں کے لشکر نے دشمن کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد قبیلہ بجیلہ کے ایک شخص نے آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کر دیا اور شہید کر دیئے گئے۔ لوگوں نے ان کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنی جان دی۔ جب عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے "اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتا ہے"! قتادہ روایت کرتے ہیں کہ ہشام بن عامر نے دشمن کی صف پر حملہ کر کے ان کی صفیں کی صفیں الٹ دیں تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہی آیت تلاوت کی۔ حسن رض نے فرمایا کہ وہ مسلمان مراد ہے جو کافر سے لڑا اور شہید کیا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوا شہید کیا گیا وہ اس آیت سے مراد ہے۔ آیت کی یہی تفسیر بہتر اور راجح ہے، جو عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل ہے کہ ہر اچھی بات کی لوگوں کو نصیحت کرنے والا (امر بالمعروف) اور بری باتوں سے روکنے والا (نہی عن المنکر) مراد ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں دو فریقوں کا ذکر کیا ہے، ایک منافق جس کے ظاہر اور باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے، جو زمین پر فساد کرتا ہے اور جب اسے مخلصانہ نصیحت کی جاتی ہے تو اس کی نخوت اسے اور زیادہ آمادۂ گناہ کرتی ہے۔ اس کے بالمقابل دوسرا شخص ہے مومن مخلص، جس نے اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالی ہے۔ اگر اس دوسرے فریق کو پہلے کے مقابل میں رکھا جائے تو مفہوم یہی ہوگا کہ جس نے اپنی جان اللہ کے راستہ میں بیچ ڈالی ہے، اس نے اسی طرح کے کسی فاسق و منافق سے مقابلہ کے وقت بیچی ہے اور اس کے مقابلہ میں شہید کیا گیا۔ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ صہیب رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی کسی خاص واقعہ اور شخص کے بارے میں آیت نازل ہونے کے باوجود حکم عام ہو سکتا ہے، اور اس کے تمام نظائر اس کے حکم کے تحت آسکتے ہیں۔

"وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ" (اور اللہ بندوں کے حق میں بڑا شفیق ہے) "رَأْفَةٌ" کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہاں مراد "شفقت و مہربانی" ہے یعنی جس بندے نے اللہ کی رضا جوئی اور اس کے راستے میں جہاد کے لیے اپنی جان تک بیچ ڈالی اس پر اللہ بڑا ہی مہربان اور شفیق ہے، اسے اپنے راستے میں مصائب اور آزمائشوں کا اللہ پورا پورا بدلہ دے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو۔ اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸ فَاِنْ زَلَلْتُمْ

کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے پھر اگر تم بعد اس کے کہ

مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ

تم کو واضح دلیلیں پہنچ چکی ہیں (صراط مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین کر رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے)

عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۴﴾

زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

ایمان لائے ہو تو پوری طرح اسے اپنالو

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" آیت میں "سِلْم" کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے یہاں مراد "اسلام" ہے، یعنی "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ"۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سدی، ابنِ زید اور ضحاک رحمہم اللہ سے یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ مراد "طاعت" ہے، یعنی اے ایمان والو، طاعت میں پوری طرح داخل ہو جاؤ"۔ ربیع سے اس معنی کی روایت ہے۔

عام اہلِ حجاز کی قراءت "سَلْم" سین کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور مراد "صلح، مصالحت" لیتے ہیں۔

جن حضرات نے اس کی قراءت سین کے کسرہ کے ساتھ کی ہے، ان میں بھی بعض نے اس سے مراد صلح ہی لیا ہے لیکن میری رائے میں راجح تفسیر یہی ہے کہ اس سے مراد "اسلام" ہے اور یہ سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جب قبیلہ کندہ کے بہت سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تو اس سلسلے میں انھیں کے ایک فرد کا یہ شعر ہے

دَعَوْتُ عَشِیْرَتِیْ لِلسِّلْمِ لَمَّا — رَأَیْتُھُمْ تَوَلَّوْا مُدْبِرِیْنَا

یہاں بھی "اَلسِّلْم" سین کے کسرہ ہی کے ساتھ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب میرے قبیلہ نے روگردانی کی اور مرتد ہو گئے تو میں نے انھیں "اسلام" کی طرف بلایا۔

ابوعمرو بن علاء رحمہ اللہ قرآن مجید کی تمام دوسری آیتوں میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے "سَلْم" سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے تھے، صرف سورۃ بقرہ کی اس آیت میں سین کو کسرہ پڑھتے، اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ سین کو کسرہ پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں پر اس کا معنی "اسلام" ہی ان کے نزدیک صحیح تھا۔ ہم نے بھی یہی تفسیر اس لیے پسند کی کہ آیت کے مخاطب مؤمن ہیں (یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اب اگر اس سے وہ مؤمنین مراد لیے جائیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تصدیق کی تھی تو ان کے ساتھ صلح اور ترکِ جنگ کی دعوت کا کوئی مفہوم نہیں ہو گا، جنگ تو دشمنوں سے ہوتی ہے اور جن سے جنگ کے امکانات ہوں انھیں کے ساتھ صلح کی بھی کوئی صورت پیدا کی جانی ممکن ہے، جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ حضور اکرم ﷺ کی جماعت کے فرد بن چکے ہیں، انھیں صلح اور ترکِ جنگ کی دعوت کا آخر کیا مفہوم ہو سکتا ہے!۔ اس کی ایک اور صورت یہ ہے کہ آیت کا خطاب ان مؤمنوں سے ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کی شریعت کی تصدیق کرتے ہوں، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نبوت سے انھیں انکار ہو۔ اس صورت میں بھی "سِلْم" سے مراد اسلام کے سوا کوئی اور دوسرا

مفہوم نہیں ہو سکتا، یعنی اے پچھلے تمام انبیاء پر ایمان لانے والو، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر بھی ایمان لاؤ۔ دعوت انھیں بھی اسلام ہی کی ہو سکتی ہے، صلح کی دعوت کا یہاں بھی کوئی مفہوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے اوپر، اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اور اسی کی دعوت دی گئی ہے؛ مسالمت اور صلح کی دعوت نہیں دی گئی، صلح کی دعوت تو حالات پر موقوف ہے، بعض حالات میں آپ حضورؐ کو اس سے روکا بھی گیا ہے، ایک موقع پر ارشاد ہے کہ "فلا تہنوا و تدعوا الی السلم و انتم الاعلون واللہ معکم" سو تم ہمت مت ہارو اور انھیں صلح کی طرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے" لیکن بعض حالات میں اس کی اجازت دی گئی ہے، یعنی اگر کفار بھی صلح پر مائل ہوں تو تمھیں بھی اس کے لیے سلسلہ جنبانی کرنی چاہیے، مثلاً ارشاد ہے "اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو (آپ کو اختیار ہے کہ) آپ بھی اس طرف جھک جائیں"؛ بنیادی طور پر، اور حالات کا لحاظ کیے بغیر صلح کی عام دعوت قرآن مجید میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

اب یہاں پر علماء کے اقوال مختلف ہو گئے ہیں کہ آیت میں "مؤمنون" سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ہیں یا صرف آپ سے پہلے کے انبیاء پر ایمان لانے والے مراد ہیں۔ جن مفسرین کی یہ رائے ہے کہ وہ مؤمنین مراد ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لائے تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں انھیں شریعت کے ایک ایک جزء پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی شریعت کے تمام احکام، تمام حدود پر بلا کسی تخصیص کے عمل کرو، ایسا نہ ہونے پائے کہ بعض پر تو عمل کرو اور بعض کو نظر انداز کر دو۔ اس صورت میں "کافۃ" سلم کی صفت ہوگا، اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والو، پوری شریعتِ اسلامی پر، بلا کسی کوتاہی و کمی کے، عمل کرو، اور اس کے کسی جزء کو بھی نہ چھوڑو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیت ثعلبہ، عبداللہ بن سلام، ابن یامین، اسد، اسید، شعبہ بن عمرو اور قیس بن زید کے بارے میں نازل ہوئی تھی، یہ سب حضرات یہودی تھے، اسلام لانے کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! سبت (سنیچر) کے دن کی ہم تعظیم کیا کرتے تھے، ہمیں اب بھی سبت منانے کی اجازت دیجیے، تورات بھی اللہ کی کتاب ہے، اس لیے رات کی نماز میں ہمیں اس کے پڑھنے کی بھی اجازت عنایت فرمائیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت میں بصراحت موجود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان ایمان لانے والوں کو اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے جو اس آخری شریعت میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کرنا چاہتے تھے، انھیں حکم ہوا ہے کہ تمام دوسرے احکام کو، جن کا حکم اسلام میں نہیں ہے، چھوڑ کر بتمام و کمال اس آخری شریعت پر عمل کریں، اور اس میں کوئی کمی زیادتی نہ کریں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اس آیت میں "پوری طرح اسلام میں داخل ہونے" کا حکم ان اہلِ کتاب کو ہے جو پچھلے انبیاء پر تو ایمان رکھتے تھے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی شریعت کا انکار کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ضحاک سے روایت ہے کہ آیت کے مخاطب اہلِ کتاب ہیں۔ میری رائے میں صحیح تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لانے والوں اور ان اہلِ کتاب کو جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے، لیکن آپ سے پہلے کے انبیاء پر ایمان رکھتے تھے، سب کو اس کا حکم

دیا ہے کہ وہ اس آخری شریعت، شریعتِ اسلام، پر بتمام وکمال عمل کریں، اور اس پر عمل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، جو بھی ایمان والا ہے وہ اس کا مخاطب ہے، اس لئے ہمیں بھی اس کے مفہوم میں تخصیص نہ کرنی چاہیئے۔ مجاہد نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ "اسلام میں، اس کے تمام احکام پر عمل کے ساتھ پوری طرح آجاؤ۔" "کَافَّةً" بمعنی "عام، سب" ہے۔ یہ معنی ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، سدی، مجاہد، ابن زید اور ضحاک رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

"وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ" اہلِ ایمان کو حکم تھا کہ کل شریعتِ اسلامی پر عمل کرو اور عمل اور قول سے اس آخری دین کے ایک ایک جزء کی تصدیق کرو۔ اسی سلسلہ میں ارشاد ہے کہ "اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ "شیطان کے نقشِ قدم" سے مراد وہ تمام راستے ہیں جو اسلام کے احکام کے خلاف ہیں۔ اس میں دوسری تمام ملتوں اور شریعتوں کے احکام و اعمال آگئے جو شریعتِ اسلامی سے جوڑ نہیں کھاتے۔

"فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ" یعنی پھر اگر تم ڈگمگا گئے، حق سے ہٹ گئے اور شریعتِ اسلامی کے خلاف کیا، اس کے بعد کہ تمہارے پاس میری طرف سے واضح نشانیاں اور دلائل آچکے اور شریعتِ اسلامی کی صحت دلائل کی روشنی میں قطعی ہو چکی، تو، اے مومنو! جان لو کہ اللہ بڑا زبردست اور غلبہ والا ہے، اور تمھیں سزا دینے سے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی، اور وہ بڑا حکمت والا ہے، قطعی اور واضح دلائل اور نشانیوں کے باوجود اس کے حکم کی مخالفت پر سزا دینا عین حکمت ہے۔ کئی مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں "بینات" (نشانیوں) سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید ہے۔ یہ رائے بھی ہماری تفسیر سے قریب ہے، کیونکہ ان آیتوں میں حضورِ اکرمؐ اور قرآن مجید ہی کے ذریعہ انھیں خطاب کیا گیا ہے، لیکن ہماری تفسیر زیادہ موزوں ہے، کیونکہ اہلِ کتاب کے علماء کے لیئے ان کی آسمانی کتابیں تورات وانجیل کی وہ آیتیں اور انبیاء کی وہ وصیتیں بھی واضح نشانیاں تھیں جن میں ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لیئے وعدہ لیا گیا تھا یا آپ کے اوصاف کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل تھے، اور اس کے ساتھ خود حضورِ اکرمؐ کی پاک، کھلی ہوئی زندگی اور قرآن مجید اور اس کا اعجاز بھی واضح نشانیاں ہیں۔ ہماری رائے کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہ، سدی، ابن جریج اور ربیع رحمہم اللہ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

(کیا یہ) لوگ اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے) ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس

وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ع (١٣)

(سزا دینے کے لیئے) آویں، اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے اور یہ سارے مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کیئے جاویں گے

سَلْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ

آپ (علماء) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھیے (توسہی) ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں

وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے اس کے پاس پہنچنے کے بعد۔ تو یقیناً حق تعالیٰ

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱﴾

سخت سزا دیتے ہیں

کیا قیامت کا انتظار ہے!

" هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ "
خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تکذیب و انکار کرنے والوں سے ہے، یعنی "ان لوگوں کو سوا اس کے اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ اللہ ان کے پاس بادل کے سائبانوں میں آجائے اور فرشتے (بھی)"۔ " اَلْمَلٰٓئِكَةُ " کو بعض حضرات رفع پڑھتے ہیں، اور " اللّٰهُ " پر اس کا عطف کرتے ہیں۔ یعنی کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ، اپنے فرشتوں کو ساتھ لے کر، بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آجائے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "فرشتے بادل کے سائبانوں میں آئیں، اور اللہ تعالیٰ جس میں چاہے آئے"۔ مذکورہ بالا قول ربیع رحمۃ اللہ سے بھی نقل ہے لیکن ایک دوسری قرات میں " اَلْمَلٰٓئِكَةِ " پر رفع کے بجائے جر ہے، اور اس کا عطف " ظلل " پر ہے یعنی کیا وہ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ بادل کے سائبانوں اور فرشتوں کے جھرمٹ میں آجائے"۔ بعض قراتوں میں " ظلل " کے بجائے " ظلال " ہے، لیکن راجح پہلی ہی قرات ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول روایت اس کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، ارشاد ہے "اور آپ کا رب آئے گا، اور فرشتے قطار قطار"۔ دوسرے موقعہ پر ہے کہ "یہ لوگ گویا صرف اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کا پروردگار خود آئے یا ان کے پروردگار کی کوئی بڑی نشانی آجائے"۔

" فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ " (بادل کے سائبانوں میں) کا تعلق " اللّٰهُ " سے ہے یا " اَلْمَلٰٓئِكَةُ " سے؟ یعنی کون بادل کے سائبانوں میں آئے گا؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا تعلق " اللّٰهُ " سے ہے، یعنی بادل کے سائبانوں میں فرشتے نہیں آئیں گے، مطلب یہ ہوگا کہ "کیا وہ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ ان کے پاس بادل کے سائبانوں میں آئے اور ان کے پاس فرشتے آئیں"۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ "بادل"، جس میں اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر ہے، عام بادل نہیں ہے، بلکہ یہ وہ بادل ہے جس نے میدان تیہ میں بنی اسرائیل پر سایہ کیا تھا، اور اسی میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آئے گا۔ قتادہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ "اللہ ان کے پاس بادل کے سائبانوں میں آجائے"، اور فرشتے ان کے پاس موت کے وقت آئیں"۔ عکرمہ نے فرمایا کہ "اللہ بادل کے سائبانوں میں آئے گا اور فرشتے اس کے اردگرد ہوں گے"۔ عکرمہ کے اس قول کی روایت ابن جریج نے کی ہے، اور کہا ہے

کہ دوسرے حضرات کا خیال یہ ہے کہ فرشتے موت کے وقت آئیں گے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "الملائکۃ" پر کسرہ ہے، اگرچہ ضمہ کے ساتھ بھی یہ مفہوم صحیح ہو سکتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "بادل کے سائبانوں میں" کا تعلق صرف فرشتوں سے ہے، یعنی فرشتے بادل کے سائبانوں میں آئیں گے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے آنے کا تعلق ہے تو وہ اپنی شان کے مطابق جس طرح چاہے گا آئے گا۔ چنانچہ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "یہ قیامت میں ہوگا، فرشتے بادل کے سائبانوں میں آئیں گے، اور اللہ رب العزت اپنی شان کے مطابق جس طرح چاہے گا آئے گا۔" میری رائے میں پہلا قول راجح ہے، یعنی "بادل کے سائبانوں میں" کا تعلق اللہ رب العزت سے ہے، اللہ تعالیٰ بادل کے سائبانوں میں آئے گا اور فرشتے بھی آئیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض بادل محراب والے ہیں، اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) ان کے حلقہ میں تشریف لائے گا۔ زیر تفسیر آیت میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے "بادل کے سائبانوں میں" آنے کی کوئی خاص صورت ہمیں معلوم نہیں، اس طرح کے امور میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں بس ان پر ایمان و اعتقاد کافی ہے، مثلاً اللہ کا آنا، اترنا وغیرہ۔ جب تک خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہ ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تشریح نہ کردی ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں ہمیں خود اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہنی چاہیے۔ بعض حضرات اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے آنے جانے، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر اللہ تعالیٰ کو بھی قیاس کرنا چاہیے، کہ وہ بھی اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ خود نہیں، بلکہ اس کا حکم ہے۔ اس سے قریب ایک قول یہ ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ کا حساب، اس کا ثواب و عذاب ہے، جیسے کہتے ہیں کہ "حاکم نے چور کو مارا"، حالانکہ مارنے والا بذات خود حاکم نہیں، بلکہ اس کام کے لیے اس کی طرف سے مقرر دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ "هَلْ يَنظُرُونَ" "مَا يَنظُرُونَ" کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس سے پہلے ہم ایسی ترکیبوں کے متعلق بحث کر چکے ہیں۔ "الغمام" کا مفہوم بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اسلام میں پوری طرح نہ داخل ہونے والے اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ بادل کے سائبانوں میں آجائے، اور فرشتے بھی، اور جو کچھ فیصلہ ہونا ہے وہ ہو جائے"۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن تم لوگ ستر سال تک ایک جگہ کھڑے رکھے جاؤ گے، تمہاری طرف نہ نظر کی جائے گی اور نہ تمہارا فیصلہ ہوگا، بلکہ تمہیں روکے رکھا جائے گا۔ تم اس صورت حال پر روؤ گے، اور اتنا روؤ گے کہ آنسو خشک ہو جائیں گے۔ پھر تمہیں آنسو دیا جائے گا، اور تم روؤ گے، اور آنسو ٹھوڑیوں، اور منہ تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت تم آہ و بکا کرو گے اور فریاد کرو گے کہ ہمارے رب کے حضور میں ہماری کوئی شفاعت کردے اور ہمارا فیصلہ ہو جائے۔ لوگ کہیں گے کہ ہمارے جد امجد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ موزوں اس کے لیے اور کون ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ نے ان کی مٹی بنائی، اپنے ہاتھ سے انھیں پیدا کیا، اپنی روح ان میں پھونکی اور ان سے گفتگو فرمائی!۔

چنانچہ لوگ آپؑ کے پاس آئیں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ان کے انکار پر لوگ دوسرے انبیاءؑ کی خدمت میں باری باری حاضر ہوکر درخواست کریں گے، لیکن تمام انبیاء شفاعت سے انکار کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر سب لوگ میرے پاس آئیں گے۔ جب مجھ سے شفاعت کے لیے کہیں گے تو میں "فحص" کے پاس آؤں گا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا، یا رسول اللہ! فحص کیا چیز ہے؟ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ "عرش کے آگے کا حصہ"۔ پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا، اور اس وقت تک سجدہ ریز رہونگا جب اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو بھیجیں گے، وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھائے گا۔ پھر اللہ رب العزت مجھ سے ارشاد فرمائے گا، محمدؐ! میں عرض کروں گا، میں حاضر ہوں۔ اور وہ تو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، کیا بات ہے؟ عرض کرونگا کہ اے میرے رب! آپ نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا۔ اس لیے اپنی مخلوق کے بارے میں میری شفاعت کو قبول فرمایئے اور لوگوں کا فیصلہ فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تمہاری شفاعت قبول کی، میں آتا ہوں اور تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ پھر میں وہاں واپس آجاؤں گا اور لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ ابھی ہم کھڑے ہی ہوں گے کہ آسمان پر بڑی شدید قسم کی کھلبلی سنائی دے گی۔ ہم اس سے گھبرا جائیں گے۔ لیکن آسمان دنیا کے ساکنین، روئے زمین کے انسانوں اور جنوں سے دگنی تعداد میں زمین پر اتر رہے ہوں گے۔ جب یہ مخلوق زمین سے قریب ہوگی تو تمام روئے زمین انکے نور سے منور ہو جائے گی۔ وہ اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے، کیا ہمارے رب بھی تمہارے ساتھ تشریف لائے ہیں؟ وہ کہیں گے کہ نہیں، اللہ رب العزت کی آمد آمد ہے۔ اس کے بعد دوسرے آسمان کے ساکنین، پہلے آسمان والوں اور روئے زمین کے انسان وجنات سے دوگنی تعداد میں اتریں گے۔ جب وہ زمین سے قریب ہوں گے تو روئے زمین ان کے نور سے منور ہو جائے گی، اور وہ بھی اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم ان سے بھی پوچھیں گے، کیا ہمارے رب تمہارے ساتھ ہیں؟ وہ کہیں گے کہ نہیں، رب السموات والارض کی آمد آمد ہے۔ اس کے بعد تیسرے آسمان کے ساکنین، اب تک اترنے والے تمام فرشتوں اور روئے زمین کے انس وجن سے دوگنی تعداد میں اتریں گے۔ جب وہ زمین سے قریب ہوں گے تو روئے زمین ان کے نور سے منور ہو جائے گی۔ وہ بھی اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم ان سے بھی پوچھیں گے، کیا ہمارے رب تمہارے ساتھ ہیں؟ وہ کہیں گے کہ نہیں، آمد آمد ہے۔ اسی طرح دوسرے آسمانوں والے، اپنے سے پہلے آچکنے والوں سے دگنی دگنی تعداد میں آئینگے اس کے بعد رب السمٰوات والارض بادل کے سائبانوں میں نزولِ اجلال فرمائے گا، اس کے ساتھ فرشتے ہونگے فرشتے تسبیح گنگنا رہے ہوں گے، اور پڑھ رہے ہوں گے "پاک ہے اس کی ذات جو مالک ہے عالم بالا کا، پاک ہے اس کی ذات جو رب ہے عرش کا، جبروت کا مالک، پاک ہے اس کی ذات جو زندہ ہے اور جس پر کبھی موت نہیں آئے گی، پاک ہے اس کی ذات جو تمام مخلوقات پر موت طاری کرتا ہے لیکن خود اس پر موت طاری نہیں ہوگی، بہت زیادہ تسبیح کے قابل، سب سے بڑھ کر ذات پاک، فرشتوں اور روح الامین کا رب، وہ بہت زیادہ پاک ذات ہے، وہ بہت زیادہ پاک ذات ہے، پاک ہے ذات ہمارے رب کی جو سب سے مانند و بالا ہے، پاک ہے ذات سلطنت والے، عظمت والے کی، پاک ہے اس کی ذات ہمیشہ ہمیشہ"، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نزولِ

اجلال فرمائیں گے ، اس دن ان کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے ۔ اللہ تعالیٰ جہاں چاہیں گے اپنے عرش کو رکھنے کا حکم فرمائیں گے ۔ پھر ایک پکارنے والا اتنی بلند آواز سے پکارے گا کہ تمام مخلوق سن لے گی ۔ وہ (اللہ کی طرف سے) اعلان کریگا کہ اے گروہ جن و انس! جب سے میں نے تمھیں پیدا کیا اس وقت سے آج تک میں خاموش رہا ، تمہاری باتیں سنتا رہا اور تمہارے اعمال دیکھتا رہا ، اب تم خاموش ہو جاؤ ، یہ تمہارے اعمال نامے ہیں ، ان میں تمہارے سب اعمال لکھے ہوئے ہیں ۔ پس جو شخص ان میں خیر پائے وہ اس پر اللہ کی حمد و شکر کرے ، لیکن جسے اپنے اعمال نامہ میں اس کے سوا کوئی اور بات ملے اسے چاہیئے کہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے ۔ اس دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا فیصلہ کر دیں گے ، جن و انس اور حیوانات سب کا ! یہ وہ دن ہو گا کہ جب بے سینگ والا جانور سینگ والے جانور سے (اگر اس نے کوئی تکلیف پہنچائی ہوگی) بدلہ لیگا اس حدیث سے قتادہ کی رائے غلط معلوم ہوتی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ فرشتے موت کے وقت آئیں گے ، اور اسی کا ذکر آیت میں "وَالْمَلَآئِکَۃُ" میں ہے ، لیکن اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے بھی قیامت کے دن حساب کے وقت آئیں گے ۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کے اقوال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ لیکن ہم طوالت کے خوف سے ان کی تفصیلات چھوڑتے ہیں ۔ حدیث اور اس کے موید صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "الْمَلَآئِکَۃُ" پر رفع ہی صحیح ہے ۔ اگرچہ جر کی قراءت میں بھی یہ معنیٰ لیے جا سکتے ہیں ، لیکن اس کے لیئے دور از کار تاویلات کرنی پڑینگی

"وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" میں "قُضِیَ الْاَمْرُ" سے مراد مخلوق کا عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ ہے ، جیساکہ ابھی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی گئی کہ قیامت کے دن ہر مظلوم ظالم سے اپنا حق وصول کرلے گا ، بے سینگ کا جانور بھی سینگ والے جانور سے اپنا بدلہ لے لے گا ۔ "وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" یعنی قیامت کے دن مخلوق کے تمام فیصلے اور تمام معاملات جو دنیا میں ظلم و ناانصافی کے ہوئے تھے سب اللہ کی طرف لوٹیں گے ، اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرنے والا اپنا بدلہ پائے گا ، اور طاعت و فرماں برداری کی زندگی گذارنے والے کو اس کے اعمال کے پھل ملیں گے ۔ سب کو اپنا حق ملے گا ، اور کافروں اور منکروں کے سوا ..... بہتوں پر اللہ کے افضال و انعامات ہوں گے اور ..... بہتوں کو اللہ معاف فرمائے گا ، اسی لیئے خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ ہی کی طرف تمام معاملات رجوع کیئے جائیں گے" ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کوئی معاملہ ایسا نہیں جس کا رجوع اللہ کی طرف نہ ہو ، سب کی ابتدا بھی اسی کے امر سے ہے ، اور بالآخر سب کا رجوع بھی اسی کی طرف ہوگا ، اس کے دربار میں ظالم اور مظلوم ، کمزور اور قوی ، غریب اور مالدار سب برابر ہوں گے اور سب کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ قیامت کے دن مل جائیں گے ، کسی پر ظلم نہیں ہوگا ، بلکہ بہتوں پر فضل و انعام ہوگا ۔ "الْاُمُوْرُ" پر الف لام بھی اسی لیئے آیا ہے کہ مراد تمام امور و معاملات ہیں ۔

انعاماتِ الٰہی کی بے قدری کرنے والوں کی سزا

"سَلْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَۃٍ بَیِّنَۃٍ" یعنی اے محمدؐ آپ بنی اسرائیل سے پوچھیئے ، جو آپ کی نبوت اور آپ کی شریعت کی تصدیق کے ذریعہ توبہ کرنے اور میری طاعت اختیار کرنے کے لیئے بس اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ میں ان کے پاس بادل کے سائبانوں میں آجاؤں اور میرے فرشتے بھی ، اور پھر میں ان کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کر دوں اور آپ پر ایمان لانے والوں اور آپ کے ذریعہ بھیجی ہوئی میری شریعت پر عمل کرنے والوں اور منکروں

کے درمیان آخری لکیر کھینچ دوں ، ان سے پوچھیئے کہ "ہم نے انھیں کتنی ہی کھلی ہوئی نشانیاں دے رکھی تھیں" یعنی اپنے انبیار کی تصدیق اور ان کی اتباع کے لیئے، لیکن انھوں نے میری تمام نشانیوں کو نظر انداز کیا، میرے تمام انعامات کی ناشکری کی، جو عہد و وصیت میں نے انھیں کی تھی اسے پس پشت ڈال دیا اور میرے انبیار کو جھٹلایا۔ "آیۃ" کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ زیر تفسیر آیت میں اس سے مراد، جیسا کہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، وہ تمام نشانیاں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور جن کا ذکر نہیں ہے، آیت کے مخاطب یہود ہیں۔ ربیع نے فرمایا کہ ان کھلی ہوئی نشانیوں میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا "عصا"، آپ کا "ید بیضا"، بنی اسرائیل کے لیئے سمندر میں راستہ بن جانا، اور اسی راستے میں ان کے دشمنوں کا ڈوب جانا، ان پر بادل کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا نزول، اور اس کے علاوہ بہت سی دوسری نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر نازل کی تھیں، لیکن تمام انعامات کے باوجود انھوں نے اللہ کے حکم کی مخالفت کی، اللہ کے انبیار اور رسولوں کو قتل کیا اور اللہ نے جو عہد ان سے لیا تھا اسے تبدیل کر ڈالا۔ آگے آیت میں اسی کے متعلق ارشاد ہے کہ "اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے، بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی ہے تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت ہے"۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے حالات کی اطلاع دے کر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے جھٹلانے اور نافرمانی کرنے پر صبر کی تلقین کی ہے، کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں ان کی قومی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے، ان کے اسلاف نے ہمیشہ اپنے انبیار کے ساتھ یہی کیا ہے۔ اس زمانہ کے یہودی بھی آخر ہیں تو انھیں کی نسل سے! بھلا اپنی روایات سے کیسے دستبردار ہو جائیں!۔

"وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" (اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے، بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی ہے، تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت ہے) میں "اللہ کی نعمت" سے مراد اسلام اور پوری شریعت اسلامی ہے۔ "وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ" یعنی جو کوئی اللہ کی نعمت، اسلام کو بدل ڈالے" اور اس میں داخل ہونے اور اس پر عمل کرنے کے بجائے اس کا کفر کرنے لگے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے وہ سزا دے گا جس کا اس نے منکروں سے وعدہ کر رکھا ہے، اور اللہ کا عذاب بڑا سخت، بڑا دردناک ہوتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے تورات پر ایمان لانے والو، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، کفر کو یک لخت چھوڑ دو، شیطان تمھیں جس گمراہی کی طرف بلاتا ہے اس کی طرف رخ بھی نہ کرو، تمہارے پاس میری طرف سے کھلی ہوئی نشانیاں آچکی ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک کھلی ہوئی نشانی ہیں، اور وہ تمام نشانیاں، دلائل و عبر جو میں نے ان کے ذریعہ ظاہر کیئے، پس میرے حکم کو، میرے عہد کو جو میں نے تم سے اپنی کتاب میں لیا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، تبدیل نہ کرو، کیونکہ جو کوئی بھی میرے حکم کو، اپنے پاس پہنچ چکنے کے بعد، بدلتا ہے اسے میں سخت اور دردناک سزا دیتا ہوں"۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے "مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ" کی تفسیر میں نقل ہے کہ "جو کوئی اللہ کی نعمت کا کفر کرتا ہے"۔ سُدّی اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی یہی مفہوم نقل ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ

دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر

اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ

کرتے ہیں حالانکہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ میں ہوں گے قیامت کے روز اور روزی تو اللہ تعالےٰ

وقف لازم

مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۲ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف

جس کو چاہتے ہیں بے اندازہ دے دیتے ہیں (ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ

پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور ڈرلاتے تھے اور ان کے ساتھ (آسمانی)

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ

کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں اُن کے امور اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولاً) وہ کتاب ملی تھی بعد اس کے کہ انکے پاس

الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ج فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا

دلائل واضحہ پہنچ چکے تھے باہمی ضدا ضدی کی وجہ سے پھر اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (مختلفین)

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ بتلا دیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۳

اس کو راہ راست بتلا دیتے ہیں

دنیا کے دھوکے

"زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" خوش نما بنادی گئی ہے دنیوی زندگی ان لوگوں کی نظر میں جو کافر ہیں" یعنی دنیوی زندگی میں گناہ ان کے لیۓ خوشنما کردیۓ گۓ ہیں، اس لیۓ وہ کثرت مال کی طلب اور اس پر فخر و غرور کرتے ہیں، اور پھر، اے محمد! آپ پر ایمان اور آپ کی شریعت کی اتباع سے ان کا یہ غرور و گھمنڈ مانع بنتا ہے، کیونکہ جن لوگوں نے آپ کی اتباع و تصدیق کی ان سے یہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، اور اس لیۓ بجاۓ آپ کی اتباع کے

"ان اہلِ ایمان سے، جنھوں نے آپ کی اتباع کی، تمسخر کرتے ہیں"، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی اتباع میں دنیا سے جائز و ناجائز ہر طرح کی لطف اندوزی اور اس کی یہ زینت باقی نہیں رہے گی" اور جو لوگ، ڈرتے رہتے ہیں، "میرے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں، میری طاعت کرتے ہیں، دنیا کی لذات و شہوات سے اجتناب کرتے ہیں، تاکہ آپ کی اتباع پوری طرح کریں، اور میرے فرائض کی انجام دہی اور طاعت و عبادت کا جو بدلہ میرے یہاں سے انھیں ملنے والا ہے اسے وہ پالیں، یہ لوگ "قیامت کے دن کفر کرنے والوں سے کہیں اوپر ہوں گے"، کیونکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو جنت میں داخل کرے گا، اور کافروں کو جہنم میں۔ عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ کی روایتیں اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ عکرمہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "کفار کہتے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی ہمارے نبی ہوتے تو آپ کی اتباع شرفاء اور سردار کرتے، بخدا، ان کی اتباع کرنے والے تو ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) جیسے محتاج اور غریب لوگ ہیں"۔ قتادہ نے "فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کی تفسیر میں فرمایا کہ "جنت میں ان سے (کفار سے) اوپر ہوں گے"۔

"وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" "یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں، تقویٰ کی زندگی گذارنے والوں کو اپنی نعمتیں اور اپنے عظیم افضال بے شمار و بے حساب عنایت فرمائے گا"۔ "بِغَيْرِ حِسَابٍ" کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں ان نعمتوں کے ختم ہونے کا خوف نہیں ہوگا کہ حساب و شمار کی ضرورت پڑے، کیونکہ دینے والا حساب اس لیے لیتا ہے تاکہ اسے معلوم رہے کہ کتنا اس نے دیا ہے، اور اس کی ملکیت میں کتنی کمی ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالےٰ کے خزانوں میں کسی طرح کی کمی کا کبھی کوئی خطرہ نہیں، اس لیئے وہ بے شمار نعمتیں عطا فرمائے گا، اسے حساب و شمار کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

اختلاف کی بنیاد اور اس کا حل

"كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَ أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ"

(لوگ، ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے انبیاء بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ حق کیساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے)۔ آیت میں "امت" کے معنی کے سلسلے میں مفسرین سے متعدد اقوال نقل ہیں، یعنی آیت میں جن لوگوں کے متعلق ارشاد ہے کہ "لوگ ایک امت تھے"، ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام کے زمانہ تک کی تمام امتیں مراد ہیں، اس مدت میں دس قرنیں ہوئیں اور سب حق پر قائم تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر نقل ہے آپؓ نے فرمایا کہ آدم اور نوح علیہما الصلوٰۃ والسلام کے درمیان دس قرنیں آئیں، ان قرنوں میں تمام لوگ شریعتِ حقہ پر قائم تھے اس کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے"۔ بیان کیا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرارت "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا" "لوگ ایک ہی امت تھے، پھر اختلاف کیا"، سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، آپ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اختلاف کے بعد سب سے پہلے نبی نوح علیہ السلام تھے۔ اسی کے ساتھ نابغہ ذبیانی کا یہ شعر بھی پیشِ نظر رکھیے ؎

حَلَفْتُ فَلَمْ أَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً وَهَلْ يَأْثَمَنْ ذُوْ أُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ

میں نے قسم کھائی اور تمہارے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ❊ اور کیا اطاعت کی زندگی گذارنے والا کوئی دیندار بھی گنہگار ہو سکتا ہے

شعر میں "امت" بمعنی دین استعمال کیا گیا ہے۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ لوگ ایک ملت اور ایک دین پر متفق تھے، پھر اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں انبیاء بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اصلاً "امت" "جماعت" کے معنی میں ہے جو ایک دین و مسلک پر مجتمع ہو، پھر امت بمعنی دین بھی استعمال ہونے لگا، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً" "اگر اللہ چاہے تو تمھیں ایک امت بنا دے، یعنی ایک دین اور ایک ملت رکھنے والا۔ اسی لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ معنی بیان کیے "كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً" یعنی سب لوگ ایک دین پر قائم تھے، پھر اختلاف کیا۔

دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام حق پر تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ذریت کے لیے انبیاء بھیجے۔ اس تفسیر میں "امت" کے معنی "اللہ کی طاعت، اس کی وحدانیت کی دعوت اور اس کے احکام کی اتباع" ہیں۔ یہ معنی ایک دوسرے موقع پر بھی مراد لیے گئے ہیں، ارشاد ہے "اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا" (بلا شبہ ابراہیم اللہ کے اطاعت گذار "امت" اور بڑے ہی خدا پرست تھے) یہاں "امت" سے مراد "امام" ہے، جس کی معاملاتِ خیر میں، اقتداء و اتباع کی جاتی ہے۔ مجاہد سے یہی قول منقول ہے کہ "امت" سے مراد آیت میں آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان دس انبیاء مبعوث ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے جن حضرات کی یہ رائے ہے، غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ فردِ واحد کو، جو اپنے اوصاف و خصوصیات کی وجہ سے پوری جماعت پر بھاری ہو، "امت" (بمعنی جماعت) کہا جا سکتا ہے، گویا جو خصوصیات اور عمدہ اوصاف پوری ایک جماعت میں ہو سکتے ہیں وہ تنہا ایک شخص رکھتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فردِ واحد کو "امت" کہنے کی وجہ ان حضرات کے نزدیک یہ ہو کہ اخلاقِ خیر کی دعوت کی بنا پر وہ لوگوں کے اجتماع کا، اور انھیں ایک امت و جماعت کی شکل دینے کا سبب ہے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد بھی، اپنے اختلافات کے باوجود چونکہ آپ کے دین پر متفق تھی، اور اس اتفاق و اتحاد کا سبب آپ ہی تھے، اس لیے آپ کو "امت" کہا گیا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "امت واحدۃ" سے مراد "دینِ واحد" ہے، یعنی جس دن تمام ذریتِ آدم کو آپ کی پشت سے نکال کر "عہدِ الست" لیا گیا تھا تو سب ایک دین پر قائم تھے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یومِ الست میں اللہ تعالیٰ نے سب کو اسلام پر پیدا کیا تھا اور اس دن سب نے اللہ کے لیے اپنی عبودیت و بندگی کا اقرار کیا تھا، سب ایک امت تھے اور مسلم و مومن تھے۔ پھر آدم علیہ السلام کے بعد انھوں نے اختلافات کیے، ابی رضی اللہ عنہ آیت کی قراءت اس طرح کرتے تھے "كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا" آخر تک۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اختلاف کے بعد انبیاء اور کتاب نازل کرتا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی قول نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آیت میں اس حالت کا ذکر ہے جب ذریتِ آدم کو آدم علیہ السلام کی پشت سے پیدا کیا گیا تھا، اس دن کے سوا کبھی انسان امتِ واحدہ نہیں بنے۔ پھر جب دنیا میں اختلافات شروع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے۔ اس تفسیر اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں صرف اتنا فرق ہے "امت واحدہ" کا وقت اس تفسیر کی بنیاد پر یومِ الست ہے، اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ ہے۔ ایک اور قول بھی مروی ہے، جو تمام دوسرے اقوال سے مختلف ہے۔ یعنی لوگ ایک دین پر تھے، اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے

انبیاء بھیجے۔ اس قول کی نسبت بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے۔

لیکن اس آیت کی مناسب اور راجح تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بندوں کو خبر دی ہے کہ لوگ ایک جماعت تھے اور ایک دین پر قائم تھے۔ چنانچہ سُدّی سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ "لوگ ایک دین، یعنی آدم علیہ السلام کے دین پر قائم تھے، پھر لوگوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے"، اور جیسا کہ ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جس دین پر لوگ اس وقت قائم تھے وہ دینِ حق تھا۔ آپ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ پھر جب لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے دین میں ان کے اختلاف پیدا کرنے کے بعد انبیاء بھیجے، جو ڈرانے والے اور خوش خبری دینے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب بھی نازل کی، تاکہ جس میں وہ اختلاف رکھتے ہیں انبیاء اس میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں، یہ اللہ کی طرف سے بندوں پر رحمت تھی، اور تاکہ لوگوں کے لیۓ عذر و معذرت کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ ممکن ہے، وہ وقت جب لوگ "امتِ واحدہ" تھے آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک کا زمانہ ہو یا یوم الست ہو، جب آدم علیہ السلام کی تمام اولاد ان کے سامنے پیش کی گئی تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ ...... جب سب لوگ "امتِ واحدہ" تھے ان دونوں کے سوا کوئی اور زمانہ ہو، بہرحال اللہ کی کتاب میں اس زمانہ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے اور نہ کسی صحیح حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، اس لیۓ ہمیں بھی وہی بات کہنی چاہیۓ جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی، یعنی لوگ ایک جماعت تھے، پھر جب اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں انبیاء اور رسول بھیجے۔ کس وقت لوگ ایک جماعت تھے؟ اگر ہمیں اس وقت کا علم ہو جائے تو کوئی نفع نہیں ہوگا اور نہ اس سے عدم واقفیت کسی نقصان کا باعث ہے، کہ اس سے ہماری واقفیت اللہ تعالیٰ کی کسی طاعت کے لیۓ ضروری نہیں۔ البتہ اس حد تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا اور آیت میں اس کے لیۓ واضح دلیل موجود ہے کہ "امتِ واحدہ" سے مراد یہ ہے کہ لوگ ایمان اور دینِ حق پر ایک جماعت کی صورت میں متحد و متفق تھے، یہ اتفاق و اجتماع جس کا ذکر آیتِ زیرِ تفسیر میں ہے، کفر و شرک پر نہیں تھا۔ اس کا ثبوت اس آیت سے بھی ملتا ہے جس میں یونس علیہ السلام کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ "وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ" (اور انسان تو ایک ہی طریقہ پر تھے، پھر انھوں نے اختلاف کیا، اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس باب میں جس میں یہ اختلاف کر رہے تھے فیصلہ کر دیا گیا ہوتا)، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وعید اختلاف پر کی ہے، اتفاق اور امتِ واحدہ ہونے پر نہیں کی ہے۔ اگر اتفاق و اجتماع اختلاف سے پہلے ہوتا اور کفر پر ہوتا، تو اختلاف کی صورت یہ ہوتی کہ کچھ لوگ کفر سے الگ ہو کر ایمان اختیار کر لیتے، اور اس طرح اختلاف کی بنیاد پڑ جاتی۔ اگر یہ صورت ہوتی تو ایسے اختلاف پر وعید کی کوئی وجہ نہیں تھی، بلکہ ایسی صورت میں تو اختلاف پر اللہ کی طرف سے وعدہ اور اختلاف کرنے والوں کی تعریف ہونی چاہیۓ تھی کہ انھوں نے کفر سے علیحدگی اختیار کی اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ توبہ و انابت کی حالت میں بھی بندے پر اللہ کی وعید نازل ہو! ۔ "فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے جنھوں نے اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو اللہ کے عظیم انعامات اور اس کی طرف سے ثواب کی خوشخبری دی۔ "وَمُنْذِرِيْنَ" یعنی جنھوں نے کفر اور اللہ کی نافرمانی کی تھی انھیں اللہ کے دردناک عذاب سے ڈرایا۔ "وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ"

لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ" (اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے) میں "کتاب" سے مراد تورات ہے، یعنی تورات کے ذریعہ ان امور میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔ فیصلہ کی نسبت آیت میں "کتاب" کی طرف کی گئی، کیونکہ انبیاء اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے، گویا اللہ کی کتاب ہی لوگوں کے درمیان حاکم وفیصل تھی۔

"وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًا بَیْنَهُمْ" اس سے مراد یہود بنی اسرائیل ہیں، انھیں کو تورات اور اس کا علم دیا گیا تھا۔ "اُوْتُوْهُ" کی ضمیر "ہ" "کتاب" کی طرف لوٹتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا۔ "مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ" یعنی اس کے بعد کہ اللہ کی نشانیاں اور اس کے دلائل ان کے پاس پہنچ چکے، اور ان پر یہ بات کھل گئی کہ جس کتاب اور اس کے احکام کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں وہ اللہ کے پاس سے بھیجی گئی ہے، وہی حق ہے اور اس میں ان کے لیے کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں، اور نہ اس کے خلاف عمل کی۔ انھیں یہود بنی اسرائیل کے متعلق اس آیت میں اللہ تعالیٰ اطلاع دے رہا ہے کہ "انھوں نے اللہ کی کتاب تورات اور اس کے حکم کی مخالفت کی، اور یہ جانتے ہوئے اس میں اختلاف کیا کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اس میں اختلاف ونزاع اللہ تعالیٰ کے حکم میں اختلاف کے مرادف ہے"، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کے حکم میں ان کا یہ اختلاف اور اتنا عظیم گناہ "آپس کی ضد کی وجہ سے" تھا۔ "بَغْیًا" مصدر ہے، "بَغٰی فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ" یعنی سرکشی کی اور حد سے تجاوز کیا۔ اسی لیے جو زخم بہت گہرا ہو، سمندر میں جب طغیانی آجائے۔ گھٹا جس سے موسلا دھار بارش ہو، ان سب کے لیے "بغی" کا استعمال ہوتا ہے، اور سب میں زیادتی اور حد سے متجاوز ہوجانے کا مفہوم مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی یہود بنی اسرائیل کا میری اس کتاب میں اختلاف جسے میں نے اپنے نبی کے ذریعہ ان پر نازل کیا تھا کسی ناواقفیت کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ اس کے بعد تھا کہ کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ حق ان پر واضح تھا، اور اختلاف ونزاع کی وجہ صرف "آپس کی ضد" تھی، یہ اقتدار وریاست کی لڑائی تھی، اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے اللہ کی کتاب کو استعمال کیا جارہا تھا" آیت کی تفسیر میں ربیع سے روایت ہے کہ اس آیت میں پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے، اور ارشاد ہوا کہ "اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی نے جنھیں وہ کتاب ملی تھی، بعد اس کے کہ انھیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں"، اور انھوں نے یہ اختلاف دنیا کی حرص اور اس کی زینت حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، صرف ریاست وامارت اور لوگوں پر اقتدار حاصل کرنا مقصد تھا، اور اسی کا مقابلہ ہو رہا تھا، چنانچہ اس کے لیے ایک نے دوسرے پر حد سے تجاوز کیا اور قتل میں بھی تامل نہیں کیا۔

"فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں جو ایمان والے تھے وہ امرِ حق بتادیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست بتادیتا ہے) "فَهَدَى اللّٰهُ" یعنی پھر اللہ نے توفیق دی "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنین کو توفیق دی، اور اپنے فضل سے انھیں وہ بتادیا جس میں اہلِ کتاب اختلاف کرتے چلے آرہے تھے۔ اگرچہ اہلِ کتاب اس میں اختلاف کی وجہ سے حقیقت سے دور ہوتے رہے، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ

نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مؤمنین کے لیۓ اس کی نشاندہی کر دی، وہ "جمعہ" کا دن ہے، اہلِ کتاب اسکے پانے کے بجائے گمراہی کے راستے پر پڑ گئے، حالانکہ جمعہ ان پر بھی اسی طرح فرض تھا، جس طرح اس امتِ مسلمہ پر فرض ہے، لیکن یہود نے جمعہ کے بجائے سنیچر کے دن کی تعظیم کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہم آخری امت ہیں، (اسکے باوجود) اوّل ہیں،...... یعنی اہلِ کتاب کو کتاب اور شریعت ہم سے پہلے دی گئی تھی، اور ہمیں ان کے بعد عطا ہوئی۔ اور وہ جمعہ ہی کا دن تھا جس میں اہلِ کتاب نے اختلاف کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت کی، اور یہود نے اسے ایک دن بعد (سنیچر کو) سمجھا، اور نصاریٰ نے دو دن بعد (اتوار کو) سمجھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ بالا حدیث کی روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ "پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ امرِ حق بتا دیا جس میں پچھلی امتوں نے اختلاف کیا تھا"۔ آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہم آخری امت ہیں، اور قیامت کے دن سب سے پہلے رہیں گے، ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے، صرف فرق اتنا ہے کہ پچھلی امتوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ہمیں ان کے بعد دی گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ امرِ حق بتا دیا جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا، اور یہی وہ دن (جمعہ کا) ہے جو اللہ نے ہمیں بتا دیا ہے، دوسری امتیں ہم سے پیچھے رہ گئیں، یہود نے دوسرے دن (سنیچر) کی تعظیم شروع کر دی، اور نصاریٰ نے تیسرے دن (اتوار) کی۔

وہ امرِ حق جس میں پچھلی امتوں نے اختلاف کیا تھا، اور امتِ مسلمہ کو بتایا گیا، اس کے متعلق دوسری رائے ابنِ زید رحمۃ اللہ کی یہ ہے کہ پچھلی امتوں نے نماز میں اختلاف کیا تھا، بعض مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بعض بیت المقدس کی طرف، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں صحیح قبلہ بتایا۔ اسی طرح پچھلی امتوں نے روزے میں اختلاف کیا، بعض فرقے آدھے دن کا روزہ رکھنے لگے، اور بعض رات کے کچھ حصے کا، پھر اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو روزے کا صحیح طریقہ اور وقت بتایا۔ اسی طرح پچھلی امتوں نے جمعہ کے دن کے بارے میں اختلاف کیا، یہود نے سنیچر کا دن اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں جمعہ کا صحیح دن بتایا۔ پچھلی امتیں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف رائے کرتی رہیں، یہودیوں نے کہا کہ وہ تو یہودی تھے، نصرانیوں نے کہا کہ وہ نصرانی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے آپ کی برأت کی، اور فرمایا کہ "وہ بڑے ہی خدا پرست، اللہ کے فرمانبردار بندے تھے، اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے"۔ پچھلی امتوں نے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا تھا، یہود نے آپ پر تہمت لگائی اور نصاریٰ نے آپ کو خدا بنا لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ کے بارے میں امرِ حق کی ہدایت کی۔ زیرِ تفسیر آیت میں انھیں ہدایتوں کا ذکر ہے، یعنی بنی اسرائیل اور دوسرے اہل کتاب جن امورِ حق میں اختلاف و نزاع کر کے حق سے دور ہو گئے ان کی صحیح حقیقت اللہ تعالیٰ نے امّتِ مسلمہ کو بتا دی۔ ربیع سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے پچھلی امتوں کے اختلاف و نزاع سے نکال کر امرِ حق کی ہدایت کی اور انھیں اس دینِ حق پر قائم کیا جس کے ساتھ اختلاف سے پہلے تمام انبیاء مبعوث ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، نماز قائم کی، زکات دینے لگے، اور بعد کے اختلاف و نزاع سے پہلے اللہ کے تمام بندے جس واحد دین پر قائم تھے انھوں نے بھی اسی کو اختیار کیا، اسی لیۓ یہ امت تمام دوسری امتوں پر قیامت

کے دن گواہ ہوگی، قومِ نوح، قومِ صالح، قومِ ہود، قومِ شعیب اور آلِ فرعون سب کے متعلق یہ گواہی دے گی کہ ان کے انبیاء نے حق ان تک پہنچا دیا تھا، لیکن ان قوموں نے اپنے نبی کی نافرمانی کی اور جھٹلایا۔ سُدّی سے روایت ہے کہ "کفار نے اختلاف و نزاع کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو امرِ حق کی ہدایت کی" "بِاِذْنِہٖ" یعنی "اپنے علم سے" اس امرِ حق کے متعلق جس کی طرف ان کی ہدایت کی تھی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ "اِذْن" بمعنی علم استعمال ہوتا ہے۔

"وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" یعنی اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے، حق کا وہ راستہ جس میں کوئی کجی نہیں، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لائے۔ اس سے اہلِ حق کی اس رائے کی صحت کا ثبوت ملتا ہے کہ بندوں پر دینی یا دنیاوی جو نعمتیں بھی ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پچھلی اہلِ کتاب امتوں نے امرِ حق میں اختلاف کیا، ہر اہلِ کتاب نے اپنے مخالف فرقہ کو جھٹلایا اور اس کی کتاب کا انکار کیا، حالانکہ تمام کتابیں اللہ کی طرف سے تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو صحیح راستہ بتایا کہ تمام کتابوں اور تمام انبیاء کی تصدیق ضروری ہے۔ لیکن پہلی تفسیر راجح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واحد کے صیغہ کے ساتھ ایک کتاب میں اختلاف بتایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ

(دوسری بات سنو) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جا داخل ہوگے حالانکہ تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش

خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا

نہیں آیا جو تم سے پہلے گذرے ہیں ان پر مخالفین کے سبب ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں

حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ

کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہو گی۔

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴿۲﴾

یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک ہے۔

امتحان تمہارا بھی ہوگا

یعنی کیا اے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والو، تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، اور تمہیں ان مصائب و مشکلات سے گذرنا نہیں پڑے گا جن سے تم سے پہلے انبیاء اور رسولوں کی اتباع کرنے والے گذر چکے ہیں، اور جس طرح انھیں تنگی اور سختی سے آزمایا گیا تمھیں آزمایا نہیں جائے گا، اور کیا تمھیں اس طرح ہلا نہیں ڈالا جائے گا جس طرح انھیں دشمنوں کے خوف و رعب سے ہلا ڈالا گیا تھا یہاں تک کہ رسول اور مومنین خیال کرنے لگے کہ اللہ کی مدد پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے، اور پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد آخر کب

آئے گی، اللہ آخر کب ہماری مدد کرے گا۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ "اللہ کی مدد ان سے قریب ہی ہے"۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انھیں ان کے دشمنوں پر غلبہ دے گا اور ان سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کرے گا۔ جیساکہ مفسرین کہتے ہیں یہ آیت غزوہ خندق کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ جب مؤمنین کو تمام قبائل عرب کی متحدہ طاقت، سخت سردی اور محاصرہ کی تنگیوں اور شدائد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی غزوہ کے شدائد ومشکلات کو ایک دوسرے موقعہ پر بیان فرمایا ہے "اے ایمان والو، اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو، جب تم پر (کئی) لشکر چڑھ آئے، پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھی، اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا تھا، جبکہ وہ لوگ تم پر آچڑھے تھے تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، اور جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے، اس موقعہ پر مسلمانوں کا پورا امتحان لیا گیا تھا اور وہ سخت زلزلے میں ڈالے گئے تھے"۔ سُدّی اور قتادہ رحمہا اللہ سے اس آیت کا یہی شانِ نزول نقل ہوا ہے کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی "لَمَّا یَاْتِکُمْ" میں "لَمَّا" بمعنیٰ "لَمْ" ہے۔ اس سلسلے میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔

"مَثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ"، یعنی "ان لوگوں جیسے حالات جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں"۔ مَثَل بمعنی شِبْہ ہے ربیع اور ابن جریج سے اسی طرح منقول ہے۔ "زُلْزِلُوْا" میں زلزلہ سے مراد دشمن کا خوف ہے، زلزلہ کا معروف و مشہور مفہوم مراد نہیں ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط	قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ	فَلِلْوَالِدَیْنِ	
لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں	آپ فرمادیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو	سو ماں باپ کا حق ہے	
وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی	وَالْمَسٰکِیْنِ	وَابْنِ السَّبِیْلِ ط	وَمَا تَفْعَلُوْا
اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا	اور مساکین کا	اور مسافر کا	اور جونسا نیک
مِنْ خَیْرٍ	فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ۵		
کام کروگے	سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (اور وہ اس پر ثواب دیں گے)		

صدقہ کہاں خرچ کیا جائے؟

یعنی اے محمدؐ! آپ کے ساتھی آپ سے پوچھتے ہیں کہ اپنا کتنا مال صدقہ میں خرچ کریں، اور کہاں خرچ کریں، کنھیں دیں، آپ کہدیجئے کہ جو کچھ مال تمھیں خرچ کرنا ہے اور صدقہ دینا ہے اسے والدین کو دو، اپنے رشتہ داروں کو دو، تم میں جو یتیم ہیں، مسکین ہیں انھیں دو اور مسافروں کو دو، کیونکہ جو مال بھی تم انھیں دوگے، جو بھلائی بھی ان کے ساتھ کروگے اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہے، تمام امور اس کے احاطۂ علم میں ہیں اور وہ تمھیں قیامت کے دن اس نیکی کا اور تمہاری فرمانبرداری کا بدلہ دے گا۔ "مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ" میں خَیْر سے مراد مال ہے جسے خرچ کرنے کے بارے میں صحابہؓ نے حضور اکرمؐ سے سوال کیا تھا اور جس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ "مَاذَا یُنْفِقُوْنَ" میں "مَاذَا"، اَیُّ شَیْءٍ (کیا چیز) کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، یعنی وہ آپ سے سوال کرتے

ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اس صورت میں "مَاذَا" محل نصب میں ہوگا۔ دوسری صورت یہ کہ یہ محل رفع میں ہو "کالَّذِیْ"
یا "اَیُّ شَیْءٍ" کے معنی میں۔

یہ آیت زکات کے حکم کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ سدی سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو زکات فرض نہیں تھی، اس میں عزیز واقارب پر خرچ کرنے اور دوسرے صدقات کا حکم ہے۔ پھر آیت زکات نے اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ ابن جریج کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ اپنا مال کہاں خرچ کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آیت میں نفلی خرچ اور صدقہ کا بیان ہوا ہے، یہ زکات نہیں ہے، بلکہ زکات کا حکم اس کے علاوہ الگ سے ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ صحابہؓ نے سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ والدین، رشتہ داروں اور ان لوگوں پر خرچ کرو جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔ ابن ابی نجیح اور ابن زید سے بھی یہی قول نقل ہے۔ ابن زید کی روایت میں ہے کہ یہ صدقہ نفل ہے اور جو مصارف بیان کیے گئے ہیں وہ ان لوگوں کے ہیں جو اس صدقہ کے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہیں۔ سُدّیؒ سے جو یہ روایت منقول ہے کہ زیر تفسیر آیت زکات کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی اور زکات کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا ہے، اس کی صحت کے لیے کوئی واضح ثبوت نہیں ہے، بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ آیت میں صرف انفاق کی ترغیب دی گئی ہے، اور خرچ کے جو مواقع بیان کیے گئے ہیں وہ اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ ان پر خرچ کرنا مزید فضیلت اور حصولِ ثواب کا باعث ہے۔ ترغیب کا یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی ہے ارشاد ہے کہ "اور اس کی محبت میں مال صرف کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں پر اور گردنوں کے آزاد کر دینے میں، اور نماز کی پابندی کرتے اور زکات ادا کرتے"۔ اس تفسیر کی تائید ابن جریج سے منقول قول سے بھی ہوتی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعاً) گراں (معلوم ہوتا) ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ

سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦﴾ ع يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ

اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق

قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر قتال کرنا (یعنی عمداً) جرم عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک ٹوک

وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ

کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے ان کو اس سے خارج کر دینا جرم عظیم

عِندَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ

ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے بدرجہا بڑھ کر ہے اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ رکھیں گے

حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَنْ يَرْتَدِدْ

اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں اور جو شخص تم میں سے اپنے دین

مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ

سے پھر جاوے پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجاوے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ

میں سب غارت ہوجاتے ہیں اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں (اور) یہ لوگ

فِيهَا خٰلِدُونَ ① إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا

دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن

وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۗ

کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں

وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ②

اور اللہ تعالیٰ اس غلطی کو معاف کردینگے اور (تم پر) رحمت کرینگے

جہاد کی فرضیت

"کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ" کُتِبَ بمعنی فُرِضَ ہے، یعنی تم پر قتال فرض کیا گیا ہے، یعنی مشرکین سے قتال و جہاد۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ آیت سے مراد صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہیں چنانچہ ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطاء سے اس آیت کے متعلق پوچھا کہ کیا اس آیت کی روشنی میں ہم سب پر قتال فرض ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ صرف ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو نزول آیت کے زمانہ میں موجود تھے۔ ابو اسحٰق فزاری سے روایت ہے کہ میں نے اوزاعی سے اس آیت کا حکم پوچھا کہ کیا قتال تمام لوگوں پر فرض ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں لیکن سربراہوں اور عوام کو قتال و جہاد چھوڑنا نہ چاہیئے، البتہ انفرادی طور پر ایک ایک فرد پر قتال و جہاد فرض نہیں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ قتال فرضِ کفایہ ہے، یعنی ابتداءً تو یہ سب پر ہی فرض ہے، لیکن اگر قوم کے اتنے افراد اس کے لیے تیار ہوجائیں جن کی لڑائی میں ضرورت ہے تو تمام قوم سے فرض ساقط ہوجاتا ہے، جیسے نمازِ جنازہ، مُردوں کو غسل دینا، انھیں دفن کرنا۔ علماءِ امت کی عام طور سے یہی رائے اور یہی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دلائل اس کے ثبوت میں متفق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اور اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر

درجہ میں فضیلت دی ہے، اور بھلائی کا وعدہ تو اللہ نے سب ہی سے کر رکھا ہے۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی فضیلت کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ مجاہدین کے ساتھ جہاد میں نہ شریک ہونے والوں کو بھی "حُسْنٰی" (بھلائی) سے نوازا جائیگا اگر جہاد میں عدم شرکت، ہر حالت میں گناہ ہوتا تو ان کے لیے "حسنٰی" کا وعدہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قتال تمام مسلمانوں پر قیامت تک کے لیئے فرض ہے۔ یہ قول سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ "کُتِبَ" کے مفہوم کے سلسلے میں ہم تفصیلی بحث پہلے کر چکے ہیں۔ "وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ"۔ "کُرْهٌ" بمعنی "ذُو كُرْهٍ" ہے۔ یعنی "در اصل یہ کہ وہ تم پر گراں اور باعثِ مشقت ہے"، جیسا کہ "وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ" میں مراد "اَهْلَ الْقَرْيَةِ" ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے ہماری اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ ضمہ کے ساتھ "کُرْهٌ" کا مفہوم یہ ہے کہ کسی دوسرے کے جبر و اکراہ کے بغیر خود کسی نے کوئی کام اپنے اوپر مسلط کر لیا ہو، اور فتحہ کے ساتھ "کَرْهٌ" کے مفہوم میں جبر و اکراہ پایا جاتا ہے، یعنی دوسرے کی طرف سے زبردستی اس پر مسلط کیا گیا ہو۔ چنانچہ معاذ بن اسلم سے روایت ہے کہ "کُرْهٌ" بمعنی مشقت ہے، اور "کَرْهٌ" بالفتح بمعنی اجبار و اکراہ ہے۔ بعض اہلِ عربیت کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ جیسے "غُسْل و غَسْل" اور "ضُعْف و ضَعْف" وغیرہ

"وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ"۔ مطلب یہ ہے کہ جہاد کو گراں مت سمجھو "کیا عجب ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو"، اسی طرح ترکِ جہاد کو پسند نہ کرو، "کیا عجب ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں باعثِ خرابی ہو"۔ سدّی سے روایت ہے کہ مسلمان جہاد کو مشقت کا کام سمجھتے تھے، اس لیئے یہ آیت نازل ہوئی ارشاد ہے کہ جہاد میں تمہارے لیئے منافع ہیں، غنیمت حاصل ہو سکتی ہے، تم فتح مند ہو سکتے ہو، ورنہ شہادت پا سکتے ہو، جبکہ جہاد نہ کرنے میں یہ فوائد تمھیں حاصل نہیں ہوں گے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، حضورِ اکرم نے فرمایا، ابنِ عباس! اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہارے لیئے لکھ دیا ہے، اگرچہ تمہاری خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اس پر خوش رہو، کیونکہ اللہ کی کتاب میں یہی کہا گیا ہے۔ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! کتاب اللہ میں یہ حکم کہاں؟ اس پر آں حضور نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" یعنی اللہ جانتا ہے، کہ تمہارے لیئے کیا چیز بہتر ہے اور کیا چیز بری ہے، اس لیئے اگر اس نے تم پر دشمنوں سے جہاد فرض کیا ہے تو تمھیں اس کے حکم کے مطابق جہاد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاد تمہارے لیئے ہی مفید اور بہتر ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، "اور تم نہیں جانتے" یعنی جو فوائد و مضرتیں اللہ کے علم میں ہیں ان تک تمہاری دسترس کہاں! اس میں جہاد کے لیئے مزید ترغیب ہے۔

فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے

"يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ" "اور آپ سے حرمت والے مہینے میں قتال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہدیجیے کہ اس میں قتال کرنا بڑا (جرم) ہے، اور اس سے کہیں بڑے (جرم) اللہ کے نزدیک اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام سے روک دینا اور اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال

دینا ہے، اور فتنہ قتل سے کہیں بڑھ کر ہے) "حرمت والے مہینے" سے مراد رجب ہے، "قِتَالٍ فِيهِ" کو جراسوجہ سے ہے کہ "عَنْ" اس سے پہلے مقدر ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ تو "عَنْ قِتَالٍ فِيهِ" قرارت کرتے تھے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اے محمد، آپ کہہ دیجئے کہ حرمت والے مہینے میں قتال کرنا بہت بڑا جرم ہے، یعنی اس کی حرمت کو توڑنا اور اس میں خوں ریزی کرنا اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔ عرب جاہلیت میں بھی حرمت والے مہینوں کا احترام کیا جاتا تھا، چنانچہ ان مہینوں میں کوئی شخص اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کی ہجو بھی نہیں کرتا تھا۔ قبیلہ مُضر والے ان مہینوں کو "أَصَمّ" (گونگا) کہتے تھے، کہ ان میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی نہیں دیتی تھی۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرمت والے مہینوں میں غزوہ نہیں کیا کرتے تھے، البتہ اگر مسلمانوں پر ہی کسی طرف سے حملہ ہوتا تو مدافعت کرتے تھے۔ اگر کسی غزوہ میں حرمت والے مہینے شروع ہو جاتے تو لڑائی بند کر دیتے تھے، اور ان مہینوں کے ختم ہونے کے بعد لڑائی دوبارہ شروع کرتے تھے[۱]۔ "صَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ" یعنی اللہ کے راستہ سے روکنا۔ بولتے ہیں "صَدَّ فُلَانٌ بِوَجْهِهِ عَنْ فُلَانٍ" یعنی فلاں شخص فلاں کے سامنے آگیا اور دیکھنے بھی نہیں دیا۔ "وَكُفْرٌ بِهِ" میں بہ کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے راستہ سے روکنا، اللہ سے کفر کرنا، مسجدِ حرام سے روکنا اور ان لوگوں کو جو اس کے رہنے والے اور اس کے متولی ہیں وہاں سے نکال دینا، یہ سب حرمت والے مہینے میں قتل سے بھی بڑھ کر ہیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ "اور فتنہ تو قتل سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔" "فتنہ" سے مراد یہاں شرک ہے۔ مفسرین متفق ہیں کہ یہ آیت ابن الحضرمی کے قتل پر نازل ہوئی تھی۔ عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر اولیٰ سے واپس ہوتے ہوئے رجب کے مہینے میں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو آٹھ مہاجرین کیساتھ بھیجا۔ اس جماعت میں انصار کا کوئی فرد بھی نہیں تھا۔ انھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھ کر بھی دیا اور فرمایا کہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے دیکھیں، اس سے پہلے نہ دیکھیں۔ اس کے بعد اس مکتوب میں جو حکم ہے اس پر عمل کریں، اور کوئی شخص بھی حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہ کرے۔ چنانچہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد مکتوب کو کھولا، اس میں لکھا ہوا تھا کہ "میرا یہ مکتوب دیکھتے ہی آگے بڑھو اور مکہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ میں پڑاؤ کرو، اور وہاں سے قریش کے حالات کی نگرانی کرو اور ان کی تمام خبریں ہمارے پاس بھیجو"، عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے مکتوب کو پڑھ لینے کے بعد کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے، پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مقام نخلہ پہنچ جاؤں اور وہاں سے قریش کے حالات کی نگرانی رکھوں، اور اس سے منع فرمایا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس حکم کی تعمیل میں پس و پیش کرے، اس لئے جو کوئی شہادت چاہتا ہے اور اس کی تمنا رکھتا ہے وہ چلے اور جسے یہ پسند نہ ہو وہ لوٹ جائے، میں تو بہر حال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ چناں چہ آپؓ روانہ ہو گئے اور آپ کے ساتھی بھی روانہ ہوئے، ان میں سے کوئی بھی

---

[۱] ائمہ اربعہ اور جمہور فقہا اس کے قائل ہیں کہ قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے، اور اب جہاد ان مہینوں میں بھی، دوسرے عام مہینوں کی طرح، کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی آچکا ہے، محرم الحرام، رجب المرجب، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ حرمت والے مہینے ہیں۔

واپس نہیں آیا۔ جب یہ قافلہ مقامِ معدن پر پہنچا تو قافلہ کے دو افراد سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہما راستہ بھول کر پیچھے رہ گئے، لیکن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ چلتے رہے اور مقامِ نخلہ میں پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ پھر قریش کا اونٹوں کا ایک قافلہ جس پر کشمش، چمڑا اور دوسرے تجارتی سامان لدے ہوئے تھے، گذرا۔ اس قافلہ میں عمرو بن حضرمی، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل وغیرہ تھے۔ مسلمان اس قافلہ کو دیکھکر گھبرائے، پڑاؤ بھی اس قافلہ کی گذرگاہ سے قریب ہی کیا تھا۔ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے (جو مسلمانوں کے قافلہ میں تھے) جھانک کر انھیں دیکھا، آپ سر منڈائے ہوئے تھے، مشرکینِ قریش نے بھی آپ کو دیکھ لیا (اور چونکہ آپ سر منڈائے ہوئے تھے اس لیئے) انھوں نے کہا کہ یہ لوگ عمرہ کے لیئے آئے ہوں گے، انھیں کیوں چھیڑیں۔ پھر مسلمانوں نے اس تجارتی قافلہ کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس دن جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ تھی۔ مسلمانوں نے کہا کہ اگر انھیں آج رات چھوڑ دیا جاتا ہے تو یہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور تمہارے لیئے مشکلات پیدا کریں گے، اور اگر انھیں قتل کیا جائے تو یہ قتل حرمت والے مہینے (رجب) میں ہوگا، اس لیئے کوئی اقدام کرنے میں پس وپیش تھا۔ آخر سب نے دل مضبوط کرکے یہ فیصلہ کرلیا کہ جو بھی قابو میں آجائے اسے قتل کر دینا چاہیئے اور ان کا سامانِ تجارت لوٹ لینا چاہیئے۔ چنانچہ واقد بن عبداللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن الحضرمی کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا اور وہیں ڈھیر کر دیا، عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قید کرلیا۔ نوفل بن عبداللہ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا اور مسلمان اسے پکڑ نہ سکے۔ پھر عبداللہ بن جحش اور آپ کے ساتھی رضی اللہ عنہم اونٹوں پر لدے ہوئے سامان اور قیدیوں کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ جب یہ لوگ حضور اکرم ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تمھیں حرمت والے مہینے میں قتال کا حکم تو نہیں دیا تھا! چنانچہ آپؐ نے قیدی اور مال لینے سے انکار فرمایا۔ حضور اکرمؐ کے ارشادات سن کر عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، انھوں نے سوچا کہ ہم تو برباد ہوگئے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی انھیں ملامت کی اور کہا کہ جس کا تمھیں حکم نہیں تھا تم نے وہ بھی کر ڈالا! حرمت والے مہینے میں قتال کی تو کسی کو بھی اجازت نہیں، پھر تم نے اس مہینہ میں قتال کیوں کیا!۔ قریش یہ طعنہ دینے لگے کہ اب محمد اور ان کے ساتھیوں نے حرمت والے مہینے کو حلال کرلیا اور اس میں خون بہانے، قیدی بنانے اور مال لوٹنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا!۔ یہودیوں نے اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے بدفالی ڈھونڈھنی شروع کر دی اور کہا کہ ابن الحضرمی کو واقد بن عبداللہ نے قتل کیا، حضرمی سے یہ نکلتا ہے کہ "حَضَرَتِ الحَرْبُ" (لڑائی آپہنچی ہے) واقد سے معلوم ہوتا ہے کہ "وَقَدَتِ الحَرْبُ" (جنگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں)۔ جب اس واقعہ پر ہر طرف سے رائے زنی ہونے لگی تو یہ آیت نازل ہوئی اور ارشاد ہوا کہ حرمت والے مہینے میں قتال یقیناً جرم ہے، لیکن فتنہ تو قتل سے کہیں بڑھ کر جرم ہے، اگر مسلمانوں نے انھیں حرمت والے مہینے میں قتل کیا ہے تو انھوں نے مسلمانوں پر اس سے بڑھ کر مظالم کیئے ہیں، انھوں نے اللہ کے کفر ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو بھی اللہ کے راستے سے روکا، مسجدِ حرام سے مسلمانوں کو روکا، اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالا، ان کے یہ اعمال اللہ کے نزدیک اس قتل سے کہیں بڑھ کر ہیں، اور اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے کہیں بڑھ کر جرم ہے، یعنی مسلمانوں کو تم اللہ کے دین کے بارے میں فتنہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے، اور ہمیشہ اس کی جدوجہد کرتے رہے کہ انھیں پھر کفر کی طرف لوٹالیں، یہ عمل تو قتل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اس سے بھی زیادہ برے

ارادے رکھتے ہیں، وہ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمھیں تمہارے دین سے پھیر دیں جب یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے کشادگی پیدا کر دی تو حضور اکرمؐ نے بھی قیدی اور مال لے لیے۔ یہ قول روایتوں میں معمولی اختلاف و اختصار کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ، جندب بن عبداللہ، سدّی، مجاہد، ابو مالک، عطار، ضحاک بن مزاحم اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابو مالک کی روایتوں میں ہے کہ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ جمادی الاخری کی آخری تاریخ (۳۰ تاریخ) ہے، لیکن (چاند ۲۹ کا ہوا تھا اور تھی وہ یکم رجب۔ بعض روایتوں میں ہے کہ مسلمانوں کو شبہ تھا کہ ۳۰ جمادی الاخری ہے، یا یکم رجب۔

اس آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ "حرمت والے مہینے میں قتال کرنا بڑا جرم ہے" اس حکم کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سورہ برارت کی آیت "بے شک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک بارہ ہی مہینے ہیں، کتاب الٰہی میں (اس روز سے) جس روز کہ اس نے آسمان اور زمین پیدا کیے، اور ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہی دین مستقیم ہے، سو تم ان کے بارے میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو، اور لڑو مشرکوں سے سب سے جیسا کہ وہ لڑتے ہیں" اور بعض دوسری آیتوں سے منسوخ ہے۔ عطار بن میسرہ اور زہری کی یہی رائے ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم منسوخ نہیں ہوا، بلکہ اب بھی باقی ہے۔ عطار کی یہی رائے ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ عطار نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے، بلکہ اب بھی باقی ہے۔

میری رائے میں عطار بن میسرہ کا قول صحیح ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے منسوخ ہو گئی ہے۔ اوپر مذکور سورۂ توبہ کی آیت سے بھی واضح طور پر یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ متواتر روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین حرمت والے مہینے ہی میں کیا تھا، اور ابو عامر رضی اللہ عنہ کو جنگ کے لیے قبیلہ اوطاس کی طرف حرمت والے مہینے میں ہی بھیجا تھا۔ اگر حرمت والے مہینوں میں جنگ و قتال گناہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مہینوں میں کوئی غزوہ کرتے۔ اسی طرح قریش کے ساتھ جنگ کے لیے مقام حدیبیہ کی بیعت (بیعت رضوان)، ذی قعدہ میں ہوئی۔ تمام علماء سیرت اس پر متفق ہیں۔ ظاہر ہے کہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۲ھ میں پیش آیا تھا اور غزوۂ حنین و طائف ۸ھ میں ہوا تھا۔

"وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا" یعنی مشرکین قریش تم سے جنگ جاری رکھینگے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمھیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ عروہ بن زبیر اور مجاہد رحمہما اللہ سے یہی مفہوم نقل ہے۔ عروہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "توبہ و رجوع تو کیا، وہ تمہارے بارے میں اس سے بھی زیادہ بُرے ارادے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمھیں تمہارے دین سے ہی پھیر دیں اور دوبارہ تمھیں کفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیں"۔

"وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" یعنی "اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے"۔ "يَرْتَدِدْ" بمعنی يَرْجِعُ (پھرنا، لوٹنا) ہے، "فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا" (پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان پر الٹے چلے) میں بھی یہی معنی ہیں۔ بولتے ہیں "اِسْتَرَدَّ فُلَانٌ حَقَّهُ مِنْ فُلَانٍ" یعنی فلاں نے فلاں سے اپنا حق واپس مانگا۔ "اور مر جائے اس حال میں کہ وہ کافر ہے" یعنی دین اسلام سے پھر کر کفر اختیار کرے اور توبہ سے

پہلے کفر ہی کی حالت میں مرجائے، "تو یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کے اعمال دُنیا اور آخرت میں اکارت گئے"۔ "حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ"، یعنی بَطَلَتْ أَعْمَالُهُمْ، ذَهَبَتْ (ان کے اعمال اکارت گئے، باطل ہوئے)، یعنی دنیا و آخرت میں اس پر جو اجر و ثواب انھیں ملتا وہ نہیں ملے گا۔ "اور یہ لوگ اہلِ دوزخ ہیں، اس میں ہمیشہ پڑے رہنے والے"، یعنی جنھوں نے دینِ اسلام سے ارتداد اختیار کیا اور کفر کی طرف لوٹ گئے ہوں اور کفر ہی کی حالت میں ان کی موت واقع ہوئی ہو۔ "أَهْلُ النَّارِ"، اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ اب جہنم کے باشندے ہو گئے، اس میں سے کبھی باہر نہیں آئیں گے جیسے "اہلِ محلہ"، ساکنینِ محلہ کو کہتے ہیں جو محلہ میں سکونت پذیر ہوں۔ "هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ"، یعنی وہ اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے، ان کے وہاں پڑے رہنے کی کوئی مدت متعین نہیں، اور نہ اس کی کوئی انتہا ہے۔

اللہ کی رحمت، اپنے پاک بندوں پر

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ"، یعنی جن لوگوں نے اللہ اس کے رسول اور اس مکمل شریعت کی تصدیق کی جسے رسول لے کر مبعوث ہوئے، "اور جنھوں نے ہجرت کی"، یعنی جنھوں نے اپنے شہر سے، مشرکین کا پڑوس چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کرلی۔ "مُهَاجَرَة"، اصلاً کینہ و دشمنی کی وجہ سے ایک شخص کا دوسرے شخص سے قطع تعلق کر لینے کو کہتے ہیں، پھر اس کا استعمال عام ہو گیا اور ہر اس شخص کے لیے اس کا استعمال کیا جانے لگا جو کسی چیز کو ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑ دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک جماعت کو بھی مہاجرین اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آپ حضرات نے اپنا گھر بار اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ مشرکین کے پڑوس میں ان کے غلبہ و تسلط کے تحت رہنا پسند نہیں تھا، کیونکہ ان کے ساتھ رہنے کی صورت میں دین کے بارے میں فتنہ میں پڑ جانے کا خوف تھا، اس لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ "وَجَاهَدُوا"، یعنی قتال کیا، جنگ کی، "مُجَاهَدَة"۔ "جَهَدَ فُلَانٌ فُلَانًا" سے نکلا ہے، یعنی فلاں کو فلاں نے مشقت اور تکلیف میں ڈال دیا۔ جب یہی عمل جانبین سے ہو اور اس عمل کے کرنے والے دو فریق ہوں تو اس کے لیے "مُجَاهَدَة" سے "يُجَاهِدُ فُلَانٌ فُلَانًا"، بولتے ہیں، یعنی دونوں فریق اپنے حریف و مقابل کو مشقت اور تکلیف میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، "جہاد" کا بھی یہی مفہوم ہے۔ "سَبِيلِ اللَّهِ" سے مراد "اللہ کا راستہ اور اس کا دین" ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا"، یعنی جن لوگوں نے مشرکوں کے غلبہ کے تحت اور ان کی حکمرانی میں رہنا پسند نہیں کیا، اور اپنے دین کے بارے میں فتنہ کے خوف سے وہاں سے دوسری جگھوں میں چلے گئے، اور اللہ کے دین کے لیے ان سے جنگ کی، "یہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھیں گے"، یعنی انھیں لوگوں کو اس کی امید ہوگی کہ اللہ ان پر رحم کرے گا اور اپنے فضل و کرم سے انھیں جنت میں داخل کرے گا "اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں کو اپنے عفو کے ذریعہ چھپانے والا اور ان پر مزید رحمت و مہربانی کرنے والا ہے"۔ یہ آیت بھی عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں ہی نازل ہوئی تھی، جیسا کہ جندب بن عبداللہ، عروہ بن زبیر، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں

لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬

اور لوگوں کو بعضے فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں اُن فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ

قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

کیا کریں۔ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو اللہ تعالیٰ اسی طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت کے

فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ

معاملات میں سوچ لیا کرو۔ اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت

لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ

رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ تمہارے (دینی) بھائی ہیں اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی

مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴

زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

چند سوالات کے جوابات

"يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" یعنی اے محمد! آپ کے صحابہ شراب اور اس کے پینے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ "خمر" ہر اس مشروب کو کہتے ہیں جو عقل کو مخمور کر دے اور اس پر پردہ ڈال دے، "خَمَرْتُ الْاِنَاءَ" (میں نے برتن ڈھک دیا) سے ماخوذ ہے، بولتے ہیں "هُوَ فِىْ خِمَارِ النَّاسِ وَغِمَارِهِمْ" یعنی لوگوں کے انبوہ میں گھس گیا اور نظروں سے چھپ گیا)۔ خواہ دوا ہو یا کوئی اور نشہ آور چیز، اگر عقل کو مخمور کر دیتی ہے اور عقل اس سے مغلوب ہو جاتی ہے تو وہ "خمر" شراب کہلائے گی۔ عورت کے دوپٹہ کو بھی "خِمَار" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ سر کو چھپاتا ہے۔ "هُوَ يَمْشِىْ لَكَ الْخَمَرَ" یعنی تم سے چھپ کر چلتا ہے۔ عجاج کے اس شعر میں بھی "الخمر" کا یہی مفہوم ہے ؎

فِىْ لَامِعِ الْعِقْبَانِ لَا يَاْتِى الْخَمَرْ ⁂ يُوَجِّهُ الْاَرْضَ وَيَسْتَاقُ الشَّجَرْ

وہ چھپ کر نہیں چلتا، بلکہ لہلہاتے ہوئے علموں کے جلو میں ⁂ زمین پر مچلتا ہوا اور درختوں کو کاٹتا ہوا۔

"اَلْمَیْسِرُ" مَفْعِل کے وزن پر "یَسَرَ لِیْ ھٰذَا الْاَمْرُ" سے ماخوذ ہے، یعنی مجھ پر یہ چیز واجب ہوگئی۔ "الیاسر" جو تیر کے ذریعہ (جوئے سے) واجب ہو، جواری کو "یاسرٌ اور یَسِرٌ" کہتے ہیں، اور "مَیْسِر" بمعنی جوا۔ ابن عباس اور عبداللہ رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابوالاحوص، ابن سیرینؒ، عطاء، طاؤس، سعید، حسن، قتادہ، سدی، ضحاک اور مکحول رحمہم اللہ سے "مَیْسِر" کے یہی معنی نقل ہیں۔ مجاہد، عطاء اور طاؤس کی روایتوں میں ہے کہ بچوں کا اخروٹ وغیرہ سے کھیلنا بھی "مَیْسِر" ہے۔ عمر بن عبیداللہؒ نے قاسم بن محمدؒ سے پوچھا، کیا چوسر اور شطرنج بھی "مَیْسِر" (جوا) ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے ذکر اور نماز سے انسان کو غافل کر دے "میسر" ہے۔ "قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ" یعنی اے محمد! آپ اپنے صحابہ سے "کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں" یعنی شراب اور جوئے میں "بڑا گناہ ہے۔" سدی سے اس بڑے گناہ کے متعلق نقل ہے کہ "شراب کا گناہ" تو یہ ہے کہ انسان شراب کے نشہ میں لوگوں کے لیے باعث آزار بنتا ہے اور "مَیْسِرُ کا گناہ" یہ ہے کہ جوا کھیل کر دوسرے کا حق مارتا ہے اور ظلم کرتا ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ قرآن مجید کی یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں شراب کے خلاف حکم نازل ہوا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ان میں بڑا گناہ ہے" سے مراد یہ ہے کہ شراب پیتے وقت آدمی کا دین کمزور پڑ جاتا ہے۔ راجح تفسیر سدی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، یعنی شرابی جب نشہ میں ہوتا ہے تو شراب کی وجہ سے اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے اور معرفت رب سے قاصر رہتا ہے، بھلا اس سے بڑھ کر گناہ اور کیا ہوگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کا یہی مفہوم ہے۔ اور میسر کی بُرائی یہ ہے کہ یہ انسان کو اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کر دیتا ہے، اور اس کی وجہ سے جواریوں میں باہم دشمنی پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے "شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں دشمنی اور کینہ، شراب اور جوئے کے ذریعہ سے ڈال دے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔"

"وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" (اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں) شراب کے فائدوں میں، اس کی حرمت کے حکم سے پہلے، اس کی خرید و فروخت کے فائدے اور اس کے پینے کی لذت وغیرہ آجاتی ہے۔ عربی اشعار شراب کے کیف و سرور اور اس کے پینے کے بعد کی امنگوں کے لیے شاہد ہیں۔ جوئے کے فائدوں .... سے مراد جیتنے والے کا فائدہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد اور سدی رحمہما اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ مدینہ کے اکثر اور کوفہ و بصرہ کے بعض علماء قرات نے "اِثْمٌ کَبِیْرٌ" پڑھا ہے۔ لیکن بصرہ اور کوفہ ہی کے بہت سے قاریوں نے "اِثْمٌ کَثِیْرٌ" پڑھا ہے (حاصل دونوں قراتوں کا ایک ہی ہے) لیکن راجح قرات پہلی ہی ہے، کیونکہ علماء قرات کا اس پر اجماع ہے، اس کے بعد "اَکْبَر" کے لفظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

"وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" یعنی شراب اور جوئے کا گناہ اور اس کی مضرت و نقصان ان کے فائدوں سے جنھیں تم حاصل کرتے ہو، کہیں بڑھا ہوا ہے۔ شراب پینے کے بعد گالم گلوج اور اس سے بڑھ کر قتل و قتال ایک عام بات تھی۔ جوئے کے سبب سے شر و فساد پھیلتا تھا اور اکثر باہم دشمنی و عداوت پیدا ہوتی تھی۔ یہ آیت شراب کی حرمت کے حکم سے

---

[1] اس دنیا میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں جس میں ہر حیثیت سے صرف مضرت و نقصان ہی ہو، فائدہ و نفع کا کوئی پہلو سرے سے ہو ہی نہ۔ عمدہ سے عمدہ چیزوں میں یہاں مضرت کے پہلو موجود ہیں اور بُری سے بُری چیز میں نفع کے پہلو، یہ تو صرف آخرت کی خصوصیت ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

پہلے نازل ہوئی تھی، اس لیئے اس کی طرف "اِثْم" (گناہ) کی نسبت کی کہ یہ گناہ کا سبب بنتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "حرمت کے حکم سے پہلے کے ان کے فائدوں کے مقابلہ میں حرمت کے حکم کے بعد ان کے گناہ کہیں بڑھکر ہیں"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، ربیع اور علی بن ابی طلحہ سے اس کی روایت ہے۔ لیکن ہم نے اس کے بجائے پہلی تفسیر اس لیئے پسند کی کہ متواتر روایتوں سے ثابت ہے کہ یہ آیت شراب اور جوے کی حرمت کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی اس سے معلوم ہوا کہ "اِثْم" سے مراد آیت میں کسی حرام کے ارتکاب کا گناہ نہیں ہے، بلکہ گناہ کی اسکی طرف نسبت اس لیئے کی ہے کہ گناہ کے ارتکاب کا یہ سبب بنتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر، عکرمہ، حسن، زید بن علی، شعبی، قتادہ، مجاہد، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت شراب اور جوے کی حرمت کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ سعید بن جبیر کی روایت میں ہے کہ جب زیر تفسیر آیت نازل ہوئی تو بہت سے صحابہ شراب کو ناپسند کرنے لگے، لیکن اب بھی بعض صحابہ پیتے تھے۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "اے ایمان والو، نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اسے سمجھنے لگو"، تو پینے والوں نے نماز کے اوقات میں پینا چھوڑ دیا۔ لیکن جب نماز کا وقت قریب نہ ہوتا تو پیتے تھے۔ آخر آیت "شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس نری گندی باتیں ہیں، شیطان کے کام، سو اس سے بچے رہو تاکہ فلاح پاؤ" نازل ہوئی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس آخری آیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب شراب حرام کر دی گئی ہے۔ زید بن علی کی روایت میں تفصیل ہے، آپ نے بیان کیا کہ شراب کے بارے میں تین مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ سب سے پہلے زیر تفسیر آیت نازل ہوئی۔ بعض صحابہ اس کے بعد بھی پیتے تھے۔ اتفاق سے دو صحابی شراب پی کر نماز کے لیئے کھڑے ہوگئے اور قرآن مجید کی آیات کی تلاوت غلط اور چھوڑ چھوڑ کر کرنے لگے۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اب پینے والوں نے نماز کے اوقات میں پینی چھوڑ دی۔ جیسا کہ زید بن علی کا بیان ہے ایک مرتبہ ایک مسلمان نے نشہ کی حالت میں بدر کے مقتولین پر نوحہ خوانی شروع کر دی۔ حضور اکرم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد آخری آیت نازل ہوئی اور حرمت کا قطعی حکم ہوگیا۔

خرچ کتنا کیا جائے؟ "وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ" اور آپ سے آپ کے صحابہ پوچھتے ہیں کہ اپنے مال میں سے کتنا صدقہ نکالیں، آپ کہدیجئے کہ "عفو"۔ عفو کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین سے مختلف اقوال نقل ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آیت میں یہ لفظ بمعنی "فضل" ہے، یعنی اہل و عیال کے اخراجات کے بعد جو بچے (وہ صدقہ کرو)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، عطاء، سدی، ابن زید اور حسن رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "عفو" سے مراد ہے "ہر چیز میں سے تھوڑا سا، اتنا کہ خرچ کرنے والا اس میں کسی قسم کا بار نہ محسوس کرے"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور طاؤس سے یہ قول نقل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "اعتدال کے ساتھ صدقہ نکالو، یعنی اتنا مال خرچ کرو جو نہ اسراف اور فضول خرچی کہا جاسکے اور نہ بخل"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ وہاں کی آسائشیں تکلیف بلکہ اکتاہٹ کے شائبہ سے بھی خالی ہوں گی اور تکالیف اور ناگواریوں میں آرام و راحت کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ کسی حرام و ناجائز چیز کے جزوی مصالح و منافع بیان کرنا اس کی حرمت و امتناع کے منافی کسی درجہ میں بھی نہیں ہے۔ (مترجم)

یعنی اتنا نہ خرچ کرنا چاہیئے کہ خود محتاج بن جائے، بلکہ اپنی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے خرچ کرنا چاہیئے۔ حسن، عطاء اور مجاہد رحمہم اللہ سے اس کی روایت ہے۔ ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل ہے کہ "عفو" کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ بھی مسلمان دیں، تھوڑا ہو یا زیادہ آپ اسے قبول کر لیجئے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ "اپنے اموال میں سے پاکیزہ اور عمدہ مال کا صدقہ نکالو" ربیع اور قتادہ سے اس کی روایت ہے۔ مجاہد سے ایک قول یہ نقل ہے کہ آیت میں "عفو" سے مراد فرض صدقہ (زکات) ہے۔

میری رائے میں راجح تفسیر یہ ہے کہ "عفو" سے مراد "فضل" ہے، یعنی اپنے اوپر اور اہل وعیال اور متعلقین پر خرچ کرنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو بچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن احادیث میں صدقہ اور اس کے مواقع کی نشاندہی کی ہے ان سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی، یا رسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے؟ حضور اکرم نے فرمایا کہ اپنے اوپر خرچ کرو۔ انھوں نے عرض کی کہ دوسرا دینار بھی ہے؟ فرمایا کہ اسے اپنی بیوی پر خرچ کرو۔ انھوں نے عرض کی کہ تیسرا بھی ہے۔ فرمایا کہ اسے اپنے بچوں پر خرچ کرو۔ انھوں نے پھر عرض کی کہ چوتھا بھی ہے۔ آں حضور نے فرمایا کہ اس کے متعلق تم خود زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر کوئی شخص محتاج ہے تو سب سے پہلے اسے اپنے اوپر خرچ کرنا چاہیئے اگر باقی بچے تو ان پر خرچ کرنا چاہیئے جو اس کے زیر پرورش ہیں اور اگر اب بھی بچتا ہے تو اسے دوسروں پر صدقہ کرنا چاہیئے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک صحابی سونے کا ایک انڈا لیئے ہوئے آئے جو انھوں نے کسی کان میں پایا تھا، انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ میری طرف سے صدقہ ہے، اللہ گواہ ہے کہ اس کے سوا آج میری ملکیت میں کچھ نہیں ہے۔ حضور اکرم نے ان سے اعراض کیا۔ وہ آپ کی داہنی طرف سے آکر پھر اپنے پہلے الفاظ دہراتے۔ آں حضور نے پھر اعراض فرمایا۔ انھوں نے تیسری مرتبہ کہا اور آں حضور نے پھر اعراض فرمایا۔ پھر جب انھوں نے چوتھی مرتبہ وہی الفاظ دہرائے تو آں حضور نے غصہ میں فرمایا کہ لاؤ دو۔ چنانچہ آپ نے اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اتنی زور سے پھینکا کہ اگر وہ انھیں لگ جاتا تو وہ زخمی ہو جاتے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لیئے لے کر چلے آتے ہو، تاکہ محتاج ہو جاؤ اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ! غنا کو باقی رکھتے ہوئے صدقہ کرنا چاہیئے۔ اس مضمون کی احادیث بکثرت ہیں، اور ان کا اس کتاب میں .... جمع کر دینا طوالت کا باعث ہوگا۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ اس مال کا ہونا چاہیئے جو ضرورت سے بچ جائے، اور یہی آیت میں "عفو" سے مراد ہے۔ کلام عرب میں بھی یہ لفظ مال اور ہر چیز میں زیادتی و کثرت ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے موقعہ پر بھی "عفو" کثرت تعداد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر تفسیر آیت میں بھی "عفو" اسی معنی میں استعمال ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انھیں حدود میں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے جس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ "بہترین صدقہ وہ ہے جو غنا کے ساتھ کیا جائے۔" اس آیت کے ساتھ اسی مضمون کی دوسری آیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ایک موقعہ پر ارشاد ہے کہ "اور وہ لوگ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور اس کے درمیان (ان کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے۔" ایک اور موقعہ پر حضور اکرم کو خطاب

کیا گیا ہے "اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی میں باندھ لے اور نہ اسے بالکل کھول ہی دے، ورنہ تو ملامت زدہ تہی دست ہو کر بیٹھ جائے گا۔"

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت کا حکم فرض زکات کے حکم کے بعد منسوخ ہوگیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ آیت زکات کے فرض ہونے سے پہلے کی ہے۔ سدی سے بھی اس کی روایت ہے کہ زکات کے حکم کے بعد یہ آیت منسوخ ہوگئی تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے، کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں "عفو" سے مراد فرض زکات ہے۔

میری رائے میں صحیح قول وہ ہے جو عطیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ زیر تفسیر آیت میں "قُلِ الْعَفْوَ" سے کوئی فرض حکم بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خرچ کا پسندیدہ طریقہ بتایا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ آیت صحابہؓ کے اس سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھی کہ کتنا مال خرچ کرنے سے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے اسی کی نشاندہی کی ہے، اس لیے نہ یہ صدقہ فرض (زکات) ہے، اور نہ کسی بھی دوسری آیت سے اس کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ اس کا حکم اس کے نزول کے بعد اب تک قائم و باقی ہے اس میں تقویٰ اور پاکیزگی کی حد مقرر کی گئی ہے کہ اپنے نفلی صدقات و عطیات میں اس سے متجاوز نہ ہونا چاہیے، اور اسی کی تربیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ "جب تمہارے پاس مال ہو تو سب سے پہلے اپنے اوپر اسے خرچ کرو، پھر اپنی اہل پر، پھر اولاد پر، اور اس کے بعد جو بچ جائے اس کے خرچ میں وہ راستہ اختیار کرو......." جو اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کا باعث ہو، اور یہی اعتدال کا راستہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ نہ اسراف و فضول خرچی ہو اور نہ بخل و کنجوسی "كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" اللہ اسی طرح تمہارے لیے کھول کر احکام بیان کرتا ہے، یعنی جس طرح میری نشانیاں اور دلائل تمہارے سامنے روشن ہیں، جس طرح اس سورت کی آیات میں میں نے اپنے فرائض و حدود تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیئے ہیں اور تمہیں بتا دیا ہے کہ کن باتوں میں تمہاری نجات ہے اور کون سے امور تمہارے لیے عذاب و سزا کا باعث ہیں، اسی طرح میں اپنی اس پوری کتاب میں، جو میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی، تمام احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہوں، "تاکہ تم میرے وعدے اور وعید اور میرے ثواب و عقاب پر خوب سوچ لو، اور دنیا کی معمولی لذت اور خواہشات نفسانی کی بہت جلد زائل ہو جانے والی مسرت کے لیے میری معصیت و نافرمانی سے اپنا دامن بچاؤ کہ یہ سب کچھ تم اپنی چند روزہ زندگی میں ہی کر سکو گے، لیکن اس کا عذاب اور اس کی سزا تمہیں بہت طویل زمانہ تک بھگتنی پڑے گی اور اتنی شدید اور ہلا دینے والی کہ اس کا تم صحیح اندازہ بھی ابھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم خوب اچھی طرح سوچ لو اور میری فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کو اپنا شعار بنالو، تاکہ اس کے بدلے میں آخرت کی لازوال نعمتوں سے سرفراز ہو سکو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے "لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" کی تفسیر میں فرمایا "تاکہ تم دنیا کے فنا و زوال اور آخرت کے بقاء کے متعلق سوچ لو کہ رہنا تمہیں وہیں ہے، اور وہ جلد ہی آنے والی ہے"۔ قتادہؒ نے فرمایا کہ "تاکہ تم دنیا پر اور آخرت کی فضیلت کے متعلق سوچ لو"۔ جو تفسیر ہم نے کی اسی کے مطابق ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

یتیموں کے متعلق

"وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ"۔ (اور آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہدیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ شرکت رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں)۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے"۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، مگر اس طریق پر کہ جو مستحسن ہو"، تو مسلمانوں نے یتیموں کے اموال سے بالکلیہ کنارہ کشی اختیار کرلی اور ان کا خرچ اپنے خرچ سے اور ان کا کھانا اپنے کھانے سے الگ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یتیموں کا خرچ تنہا ہونے کی وجہ سے زیادہ ہونے لگا اور اس کا بار قدرتی طور پر ان کے مال پر پڑا۔ اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے یتیموں کو خرچ میں شریک کر لیا اور کھانا پینا ایک ساتھ ہونے لگا۔ اس آیت کا یہی شانِ نزول سعید، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے منقول ہے۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلے میں یہ روایت بھی ہے کہ جب یتیموں کا مال ظلماً لے لینے پر وعید نازل ہوئی تو مسلمانوں نے جن کی پرورش میں کوئی یتیم بچہ تھا، ازراہِ احتیاط کھانا پینا اور برتن تک الگ کر لیا۔ چونکہ یہ صورتِ حال لوگوں کے لیئے دشواری کا باعث تھی اس لیئے صحابہؓ کے سوال پر اللہ تعالیٰ نے زیرِ تفسیر آیت نازل کی اور ارشاد ہوا کہ اس درجہ احتیاط مطلوب نہیں ہے، بلکہ یتیموں کی مصلحتوں کی رعایت رکھنا چاہیئے، یتیموں کو اپنے ساتھ اخراجات میں شریک رکھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ بدنیتی کا مظاہرہ نہ ہونا چاہیئے، کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کس کا مقصد اصلاح ہے۔ اس مضمون کی روایت شعبی، عطاء بن ابی رباح اور مجاہد رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یتیم کے مال سے غایت درجہ احتیاط اور اس سے الگ تھلگ رکھنا عربی اخلاق کا ایک ضروری جزء تھا، اس میں چونکہ دشواری تھی، اس لیئے صحابہؓ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا اور اسی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، سدی اور ضحاک سے اس کی روایت ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اے محمد! آپ سے آپ کے صحابہ یتیموں کے مال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہ ان کے مال کے ساتھ مشترکہ خرچ میں، کھانے پینے، سکونت اور ملازم وغیرہ رکھنے میں اپنا مال ملا سکتے ہیں یا نہیں۔ آپ ان سے کہدیجئے کہ تمہارے لیئے دنیاوی اور اُخروی دونوں حیثیتوں سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ان کے اموال میں اصلاح کا خیال رکھو، اور اس کا کوئی بدلہ ان کے مال سے نہ لو، اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہارے لیئے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے اجر و ثواب کا باعث ہوگا، اور اس دنیا میں ان کے مال کی حفاظت و اصلاح کے لیئے بھی بہتر ہوگا۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ خرچ میں شریک کر لو اور کھانے پینے اور سکونت میں حسب حصہ مشترک طور پر خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی بھائی ہیں، اور بھائی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہی ہیں۔ ایک بھائی اگر صاحبِ مال ہے تو وہ اپنے محتاج بھائی کی مدد کرتا ہے، اگر قوی ہے تو وہ اپنے کمزور بھائی کی مدد کرتا ہے، مسلمانو! تمہارا معاملہ تمہارے زیرِ پرورش یتیموں کے ساتھ بھائیوں ہی جیسا ہے، تمھیں ایک شفیق اور خیرخواہ بھائی کی طرح ان کے مال و جائداد کے مصالح کی رعایت ہر موقعہ پر ملحوظ رکھنی چاہیئے، اگر مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ تمہارے اور ان کے اخراجات مشترک ہوں تو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے اور یہ صورت تمہارے لیئے قطعاً جائز ہوگی، بھائیوں میں باہم مغایرت کا کیا سوال!۔ عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن زید اور ابراہیم رحمہا اللہ سے مختصراً یہی مفہوم نقل ہے۔

"وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ" یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ نے، جو تم سب کا پالنے والا ہے، خرچ میں اپنے مال کے ساتھ ان کے مال کو شامل کر لینے کی اجازت تمھیں دی ہے، لیکن اگر تمہاری نیت اس اشتراک کے معاملہ میں صحیح نہیں ہے، تم اس طرح ان کا مال ناجائز طریقہ سے اپنے استعمال میں لانا چاہتے ہو اور مشترکہ خرچ کے ذریعہ ان کے مال و جائداد میں فساد کرنا چاہتے ہو تو اللہ سے ڈرو، کہ اس کی وجہ سے تم اللہ کی سخت سزا کے مستحق ہو جاؤ گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ خوب جانتا ہے کہ ایک یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر خرچ کرنے میں کس کی نیت میں فساد ہے اور کون اس کے مال میں اصلاح کا ارادہ رکھتا ہے۔ ابنِ زید اور شعبی سے یہ تفسیر منقول ہے۔

"وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ" "اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں مشقت اور پریشانی میں ڈال دیتا"، اور یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر خرچ کرنے کی جو تمھیں سہولت دی ہے، اس کی تمھیں اجازت نہ دیتا۔ اور اب از راہِ رحمت و شفقت جو تمھیں رخصت دی ہے، اگر یہ رخصت نہ دیتا تو تم اللہ کے حق اور اس کے فرض کو کما حقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہوتے۔ "لَاَعْنَتَكُمْ" کی تفسیر میں مجاہد سے یہ روایت ہے کہ "تمھیں مویشی چرانے اور سالن کی سہولت سے محروم رکھتا"، مجاہد رحمۃ اللہ کی مراد یہ ہے کہ یتیم کے سرپرست اور یتیم کے مویشیوں کو ایک ساتھ چرانے کی اجازت نہ ہوتی اور نہ یتیم کے سالن میں سے کھانا تمہارے لیے جائز ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس میں تنگی ہو جاتی اور یتیموں کے سرپرست، پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ "فَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ" سے بھی وہ ولی اور یتیم کے مویشیوں کو ایک ساتھ چرانا اور سالن کی شرکت مراد لیتے ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ "اگر اللہ چاہتا تو تمھیں تنگی اور دشواری میں ڈال دیتا، لیکن اس نے، اس کے بجائے، تمھیں سہولت دی، تمہارے لیئے وسعت پیدا کی، اور یہ حکم نازل فرمایا کہ "جو (یتیم کا سرپرست) صاحبِ مال ہے وہ (یتیم کے مال کو اپنے استعمال میں لانے سے) بچا رہے، اور اگر محتاج ہے تو وہ حسبِ دستور (یتیم کے مال میں سے) کھا سکتا ہے"۔ ہم نے جو تفسیر بیان کی ہے، وہی قتادہ، ربیع اور ابنِ زید رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں جتنے اقوال اوپر نقل ہوئے ہیں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں لیکن مفہوم اور حاصل سب کا ایک ہی ہے۔ "عَنِتَ فُلَانٌ"، مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" (آں حضورؐ کے لیئے تکلیف دہ ہے وہ چیز جو تمہارے لیئے باعثِ مشقت ہو)۔ "ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ" (یہ اس کے لیئے ہے جو مشقت سے ڈرتا ہو) "عَنِتَ"، جب مزید میں "اَعْنَتَ" ہو جاتا ہے تو اس کے معنی "مشقت میں ڈالنا" ہو جاتے ہیں۔ "اَعْنَتَ فُلَانٌ" فلاں نے مشقت میں ڈال دیا، یعنی ایسا حکم دیا جس کی انجام دہی باعثِ مشقت تھی۔

"اَعْنَتَكُمْ" کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ "تمھیں ہلاک کر دیتا"، یعنی اس سے پہلے یتیموں کے اموال میں تم نے جو بے عنوانیاں کی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کی سزا میں تمھیں ہلاک کر دیتا۔ یہ تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ"، "بلاشبہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے"، یعنی اپنی سلطنت اور غلبہ میں زبردست ہے، اگر وہ کسی کو سزا دینا چاہے تو کوئی مانع نہیں بن سکتا، اور وہ حکمت والا ہے، وہ تمام اُمور کے انجام سے واقف ہے، اس لیئے ہر حکم جو وہ اپنے بندوں پر نازل کرتا ہے اور اس کی ہر تدبیر پر از حکمت ہوتی ہے۔ اس کی تدبیر میں کہیں سے کوئی خامی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف بندے چونکہ انجام سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیئے وہ جو بھی تدبیر اختیار کریں گے وہ اس درجہ کی کامل اور صاف ستھری نہیں ہو سکتی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی کیوں نہ ہو

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ

وہ (ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے گو وہ تم کو اچھی ہی معلوم ہو اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو

حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ

جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاویں اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے کافر مرد سے گو وہ تم کو

اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا

اچھا ہی معلوم ہو (کیونکہ) یہ لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت

اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ

اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں اپنے حکم سے اور اللہ تعالیٰ اس واسطے آدمیوں کو اپنے احکام بتلا دیتے ہیں

۲۷ ع۵ ۱۱ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۵ ع

تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں

مشرکوں سے نکاح کی ممانعت

" وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ " اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں"۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر مشرک عورت سے ہر مسلمان مرد کے نکاح کی حرمت ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کے شرک میں مبتلا ہو۔ اس عموم میں بت پرست، یہودی، نصرانی اور مجوسی سب آجاتے ہیں، کیونکہ خالص توحید کسی کے یہاں نہیں۔ اس کے بعد اہلِ کتاب کے ساتھ نکاح کی حرمت کو دوسری آیت "آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیز (کھانے کی) ہم پر حلال کی گئی ہے، آپ کہہ دیجئے کہ تم پر کل پاکیزہ جانور حلال ہیں، اور تمہارے سدھے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار"، تا "اور جو لوگ اہلِ کتاب ہیں ان کا کھانا تمہارے لیے جائز اور تمہارا کھانا ان کے لیے جائز، اور اسی طرح تمہارے لیے جائز ہیں مسلمان پارسا عورتیں اور ان کی پارسا عورتیں جن کو تم سے قبل کتاب مل چکی ہے"، نے منسوخ کر دیا۔ اب حکم یہ ہے کہ ان میں سے اہلِ کتاب کی عورتوں کے ساتھ تو نکاح جائز ٹھہرا، لیکن دوسری مشرک عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، حسن بصری، مجاہد اور ربیع رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

دوسرا قول اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ آیت کا حکم عام نہیں ہے، بلکہ صرف مشرکین عرب یا ان کے جیسے بت پرست مجوس اور غیر اہلِ کتاب مراد ہیں، اس لیے اس آیت کا کوئی حکم کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔ آیت کے الفاظ میں اگرچہ عموم ہے، لیکن مراد خاص ہے۔ یہ قول قتادہ اور سعید بن ابی جبیر سے منقول ہے۔

شہر بن حوشب کے واسطہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی ایک تفسیر یہ بھی نقل ہے کہ آیت کا حکم عام ہے، اور یہ کسی دوسری آیت سے منسوخ بھی نہیں ہے، یعنی ایک مسلمان صرف مسلمان عورت سے ہی نکاح کر سکتا ہے، کسی غیر مسلم عورت سے، خواہ وہ بت پرست ہو، مجوسی ہو یا کتابی ہو، اس کے لیے نکاح کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اور جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اس کا عمل اکارت ہو گیا"۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا تھا اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانیہ سے نکاح کر لیا تھا تو عمر رضی اللہ عنہ ان پر اتنے شدید ناراض ہوئے کہ شاید کوئی اقدام کر بیٹھتے لیکن ان حضرات نے کہا کہ امیر المؤمنین، آپ ناراض نہ ہوں، ہم طلاق دے دیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ طلاق تو اس وقت ہوتی جب نکاح بھی صحیح ہوتا، انھیں جدا کر دو۔

راجح تفسیر قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، یعنی آیت کے الفاظ میں اگرچہ عموم ہے، لیکن مراد مشرکین ہیں، اہلِ کتاب اس سے مراد نہیں ہیں۔ اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے اور کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا۔ قرآن مجید ہی میں پاکدامن اہلِ کتاب عورتوں سے اسی طرح نکاح کی اجازت ہے جس طرح پاکدامن مؤمنات سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اگر یہ آیت زیر تفسیر آیت کے کسی حکم کے لیے ناسخ ہے تو اس کی دلیل ہونی چاہیے، جو نہیں ہے۔ شہر بن حوشب نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو رائے نقل کی ہے، وہ بے معنی ہے، کیونکہ تمام امت اہلِ کتاب عورت سے مسلمان کے نکاح کو جائز قرار دیتی ہے، اور یہ مسئلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہے۔ شہر بن حوشب کی روایت کے بالکل برعکس عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے، اس سے صحیح روایت کے ساتھ، اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کا جواز نقل ہے۔ یزید بن وہب بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمان نصرانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے، لیکن مسلمان عورت کو نصرانی مرد سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے طلحہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما کے اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کو ناپسند فرمایا تھا، لیکن اس کی وجہ محض پیش بندی تھی، آپ نے تنبیہ اس خطرہ کے پیش نظر کی تھی کہ مسلمانوں میں اس طرح کی شادیوں کا رجحان عام پیدا ہو سکتا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اگر ابتدا ہی میں اس رجحان کو نہ روکا جاتا تو مسلمان عورتوں کے رشتوں میں مشکلات پیش آتیں۔ شقیق بیان کرتے ہیں کہ جب حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں لکھا کہ اسے جدا کر دو۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان سے لکھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے علیحدگی کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہ نکاح حرام ہے؟ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اسے حرام نہیں سمجھتا، لیکن مجھے خوف ہے کہ اس رجحان کے نتیجہ میں مسلمان عورتوں کے لیے مشکلات پیش آجائیں گی۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں، لیکن اہلِ کتاب مرد ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ کمزور ہے، لیکن شہر بن حوشب کی روایت کے مقابلہ میں اس قول کو ہم اس لیے بھی ترجیح دیں گے کہ اس پر امت کا اجماع ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اے مؤمنو! اہلِ کتاب کے سوا، مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور اللہ، اس کے رسول اور شریعت کی تصدیق کریں"۔

"وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ" "اور یقیناً اللہ، اس کے رسول اور اس کی شریعت پر ایمان لانیوالی کنیز، اللہ کے یہاں، اس آزاد عورت سے بہتر ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہے، خواہ اسے حسب و نسب میں شرافت و عزت ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ ایک دوسرے موقعہ پر اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا ہے کہ باعزت اور شریف گھرانوں کی مشرک عورتوں سے نکاح کی خواہش بھی دل میں نہ رکھو، کیونکہ نکاح کے لیے مسلمان کنیزیں اللہ کے یہاں اپنے

بہتر ہیں،، بیان کرتے ہیں کہ ایک مسلمان نے ایک کنیز سے نکاح کر لیا تھا، انھیں اس پر ملامت کی گئی اور کسی مشرک عورت سے نکاح کی ترغیب دی گئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ سدی بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، ان کے پاس ایک حبشن کنیز تھی۔ ایک دن وہ اس پر غصہ ہوئے اور طمانچہ مار دیا۔ بعد میں اپنے اس فعل پر بہت گھبرائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔ حضور اکرمؐ نے دریافت فرمایا کہ وہ کیسی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ، روزے رکھتی ہے، نماز پڑھتی ہے، وضو اچھی طرح کرتی ہے اور گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ پھر تو وہ مومنہ ہے! عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کروں گا۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کے اس اقدام پر بعض مسلمانوں نے انھیں ملامت کی اور کہا کہ تم نے ایک کنیز سے شادی کر لی! ۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی مشرکین کے کسی معزز گھرانے میں شادی کرا دیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آنے والی کنیز کسی معزز اور شریف گھرانے کی مشرک عورت سے بھی بہتر ہے۔ ابن جریج سے بھی آیت کا یہی مفہوم نقل ہے۔ ”وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ“ یعنی اگرچہ مشرک عورت اپنے حسن و جمال، مال و دولت اور حسب و نسب کی وجہ سے تمھیں پسند ہی کیوں نہ ہو۔ بہر حال تم ان سے نکاح نہ کرو، کیونکہ اللہ کے نزدیک مومنہ کنیز ان سے بہتر ہے۔

”وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ“، یعنی مومن عورتوں پر حرام ہے کہ وہ کسی مشرک مرد سے نکاح کریں، خواہ وہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہو۔ پس اے مسلمانو، تم اپنی عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں نہ دو، کیونکہ یہ تم پر حرام ہے بلکہ ایک مومن غلام جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کرتا ہو، بہتر ہے کہ تمہاری عورتیں اس کے نکاح میں ہوں۔ بمقابلہ کسی مشرک کے، خواہ وہ صاحب حسب و نسب ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ تمھیں اس کا حسب و نسب پسند ہی کیوں نہ ہو۔ ابو جعفر محمد بن علی کہتے تھے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا نکاح اس کے ولی کے ذریعہ ہوگا۔ ”وَلَا تُنْكِحُوا“، تا کے رفع کے ساتھ، قتادہ اور زہری سے آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ ”تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم کسی یہودی، نصرانی، مشرک یا کسی بھی ایسے شخص سے نکاح کرو جو تمہارے دین (اسلام) پر نہیں ہے“ (عورتوں کے لئے)۔ ابن جریج نے فرمایا یعنی جب تک کوئی مشرک ایمان نہ لے آئے، محض اس کی عزت و شرف کی وجہ سے اس سے نکاح نہ کرو۔ عکرمہ اور حسن بصری رحمہما اللہ سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔

”اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ“ ”یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں“، یعنی یہی مشرک مرد اور عورتیں جن سے نکاح کرنا مسلمان مردوں اور عورتوں پر حرام ہے ”تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں“، یعنی اس عمل کی طرف جو جہنم کی آگ میں تمھیں داخل کر دے اللہ اور اس کے رسول کا کفر جو وہ خود کرتے ہیں اس کی طرف تمھیں بھی بلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کی نصیحت پر عمل نہ کرو، ان کی بات نہ مانو اور ان سے نکاح نہ کرو، کیونکہ یہ تمہارے لیئے بڑے گھاٹے کا سودا ہوگا، بلکہ اس کے بجائے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، وہ تمھیں جس کام کا حکم دیتا ہے اسے بجا لاؤ، جس سے روکتا ہے اس سے رک جاؤ، کہ ”وہ تمھیں جنت و مغفرت کی طرف بلاتا ہے“، یعنی تمھیں اس عمل کی دعوت دیتا ہے جو تمہارے جنت میں داخلہ کا باعث

ہو اور جس کی وجہ سے اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے۔ "بِاِذْنِہٖ" یعنی اللہ تمہیں اس کی طرف وہ راستہ "دکھا کر اور اس کی نشان دہی کر کے" بلاتا ہے جو تمہیں جنت میں پہنچا دے اور تمہاری مغفرت کا باعث ہو۔ "اور اللہ اپنی نشانیوں کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے" یعنی اپنی کتاب میں اپنے رسول کی زبانی اپنے بندوں کے لیے دلائل اور نشانیاں صاف صاف بیان کرتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں، ان دو راستوں میں تمیز کریں جن میں ایک آگ کی طرف لیجانے والا ہے اور دوسرا جنت اور اللہ کی مغفرت کی طرف! اور پھر وہ راستہ اختیار کریں جو ان کے لیے بہتر ہو۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي

اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ گندی چیز ہے تو حیض میں تم عورتوں سے علیحدہ

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ

رہا کرو اور ان سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک ہو جاویں پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جاویں تو ان کے

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

پاس جاؤ جس جگہ سے تم کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنیوالوں سے اور محبت رکھتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

صاف پاک رہنے والوں سے۔

حیض کے متعلق سوال کا جواب

"وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ" اے محمد، آپ کے صحابہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، "جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حیض کا حکم پوچھا تھا۔ اس کے بارے میں اللہ کے حکم سے پہلے حائضہ عورتوں کے ساتھ مرد ایک گھر میں نہیں رہتے تھے اور نہ ان کے ساتھ کھانا پینا کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا ہے کہ جب کسی کی بیوی کو حیض آ رہا ہو تو اللہ کا حکم یہ ہے کہ صرف ان سے جماع و ہم بستری سے پرہیز کیا جائے، اس کے سوا، کھانے پینے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ قتادہ اور ربیع سے اس کی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ حائضہ عورتوں کے ساتھ فطری ہم بستری تو نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے بجائے پیچھے کی طرف سے ہم بستری کرتے تھے۔ آیت میں اس کی ممانعت کی گئی اور حکم ہوا کہ اس ارادہ سے عورتوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے ساتھ ہم بستری کرو، لیکن غیر فطری، پیچھے کی طرف سے ہم بستری ہر حال میں حرام ہے۔ مجاہد سے اس کی روایت ہے۔ سُدّی سے روایت ہے کہ سوال کرنے والے ثابت بن دحداح انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

"قُلْ هُوَ اَذًى" آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے۔ "اَذًى" کے معنی ہیں "وہ چیز جو باعث ناگواری و تکلیف ہو" آیت میں مراد "گندگی، بدبو اور نجاست" ہے۔ اس مفہوم میں "اَذًى" کے معنی کی بہت سی خصوصیات آگئی ہیں۔

مفسرین نے آیت میں اس لفظ کے مختلف معنی مراد لیۓ ہیں۔ سُدّی اور قتادہ سے "گندگی" نقل ہے، مجاہدؒ نے فرمایا کہ اس کے معنی "خون" ہیں، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ یہ خون ہے"۔

"فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الۡمَحِيۡضِ" "پس حیض کے زمانہ میں عورتوں سے جماع وہم بستری سے بچے رہو"۔ یہی مفہوم ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حائضہ عورت کے تمام بدن سے مرد اپنے آپ کو جدا رکھے اور بدن کے کسی حصہ کے ساتھ بھی مباشرت ومساس نہ کرے۔ محمد بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے پوچھا کہ اگر میری بیوی حائضہ ہو تو مجھے اس کا کیا جائز ہوگا۔ انھوں نے فرمایا کہ لحاف ایک رکھ سکتے ہو، لیکن بستر الگ الگ ہونے چاہئیں۔ آل عباس کے مولا ندبہ بیان کرتے ہیں کہ میمونہ بنت حارث اور حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی کے پاس بھیجا۔ ان کی آپس میں عورتوں کی طرف سے قرابت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بستر ان کی بیوی کے بستر سے الگ ہے۔ میں نے سمجھا کہ باہمی رنجش کی وجہ سے ایسا ہوگا، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بستر الگ الگ کیوں ہیں؟۔ انھوں نے فرمایا کہ میں حائضہ ہوں، اور جب مجھے حیض آتا ہے تو میں بستر الگ کر لیتی ہوں۔ میں نے واپس آکر میمونہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما سے یہ بات کہی تو انھوں نے مجھے دوبارہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ آپ کو آخر کیا ہوگیا ہے! کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کرتے ہیں؟۔ خدا گواہ ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج میں سے کسی بھی زوجہ مطہرہ کے ساتھ اس وقت بھی سوتے تھے جبکہ وہ حائضہ ہوتیں، اور حضور اکرمؐ اور ان کے درمیان صرف اتنا بڑا کپڑا حائل ہوتا جو گھٹنے سے لمبا نہیں ہوتا تھا۔ جن حضرات کی یہ رائے ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حالتِ حیض میں جدا رکھنے کا حکم دیا ہے اور کوئی تخصیص نہیں کی کہ بدن کا کون حصہ جُدا رکھا جائے اور کون جدا نہ رکھا جائے، اس لیۓ آیت کے عموم پر عمل کیا جائے گا اور مرد کو چاہیئے کہ حالتِ حیض میں عورت کے بدن کے تمام حصوں کو اپنے سے جُدا رکھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف "گندگی کی جگہ" کو دور رکھنے کا حکم دیا ہے، یعنی وہ مقام جہاں سے حالتِ حیض میں خون نکلتا ہے۔ مسروق بن الاجدع بیان کرتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حالتِ حیض میں عورت کی کیا چیز مرد کے لیۓ جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہر چیز، سوا جماع کے۔ مسروق ہی کی ایک روایت میں ہے کہ وہ سوار ہوکر عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ سلام ہو نبیؐ پر اور ان کے گھر والوں پر۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انھیں خوش آمدید کہا اور اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ اندر گئے اور عرض کی کہ میں ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن شرم آتی ہے!۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں تمہاری ماں ہوں اور تم میرے بیٹے ہو اس لیۓ شرم کی کیا بات ہے، پھر آپ نے پوچھا کہ عورت کو جب حیض آرہا ہو تو مرد کے لیۓ اس کی کیا چیز جائز ہے؟۔ فرمایا کہ شرمگاہ کے سوا اور سب کچھ جائز ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جامۂ زیریں سے اوپر سب کچھ جائز ہے، بعض میں ہے کہ جامۂ زیریں اگر بندھا ہوا ہو تو عورت کے ساتھ سونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس مضمون کی متعدد روایتیں آپ سے منقول ہیں۔ ابن عباس اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور حسن، مجاہد، عامر اور عکرمہ رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ ان حضرات کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور جس کا ثبوت تواتر کے ساتھ ہے کہ حضور اکرمؐ، حائضہ ہونے کی حالت میں

بھی، ازواج مطہرات کے جسم کے ساتھ اپنا جسم ملایا کرتے تھے، اگر حائضہ عورت کے تمام جسم کو جدا رکھنا ضروری ہوتا تو حضور اکرم ص کبھی ایسا نہ کرتے۔ حضور اکرم ص کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں بھی تمام جسم مراد نہیں، بلکہ صرف اس کا بعض حصہ ہی مراد ہے۔ اور ہم اس بعض سے صرف شرمگاہ ہی اس لیئے مراد لیں گے کہ حالتِ حیض میں مرد پر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت میں "ناف سے گھٹنے تک" جدا رکھنا مراد ہے۔ حالتِ حیض میں عورت کے اس سے اوپر اور نیچے کے حصوں سے مرد اپنے بدن کا مساس کر سکتا ہے یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ اور شریح اور سعید بن مسیب رحمہا اللہ سے منقول ہے۔ ان کی دلیل اس مضمون کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث ہیں جو صحیح ہیں۔ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ہم (ازواجِ مطہرات) میں سے کوئی حائضہ ہوتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مباشرت کرنا (اپنے جسم سے لگانا) چاہتے تو ازار (تہبند) باندھنے کا حکم دیتے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ص حالتِ حیض میں ازار کے اوپر کے حصے کے ساتھ مباشرت کرتے، عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس مضمون کی روایتیں منقول ہیں۔ اس مضمون کی صحیح احادیث بکثرت ہیں، اگر سب کو جمع کیا جائے تو طوالت ہوگی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ حالتِ حیض میں حضور اکرم ص نے جو کیا وہ جائز ہے، یعنی ازار کی جگہ کو چھوڑ کر عورت کے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ لگانا، اور یہی موضع ازار ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے، اس لیئے اس کے سوا حائضہ عورت کے جسم کے باقی حصوں کو مرد اپنے جسم سے لگا سکتا ہے۔ یہی قول میری رائے میں بھی راجح ہے، کیونکہ حضورِ اکرم ص کی احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

"وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ"۔ "يَطْهُرْنَ" کی ایک قراءت تو یہی ہے "ھا" کے ضمہ اور اس کے بعد سکون کے ساتھ۔ اس قراءت کی صورت میں مفہوم یہ ہے کہ "اور عورتوں سے اس وقت تک قربت نہ کرو جب تک ان کے حیض کا خون بند نہ ہو جائے اور وہ پاک ہو جائیں"۔ مجاہد، عثمان بن الاسود اور عکرمہ رحمہم اللہ سے یہ قول منقول ہے۔ دوسری قراءت "يَطَّهَّرْنَ"، "ھا" پر تشدید کے ساتھ ہے، اس سے مراد بمبالغہ طہارت ہوگی، یعنی "جب تک وہ حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل نہ کر لیں ان سے قربت نہ کرو"۔ یہی دوسری قراءت راجح ہے۔ اسلیئے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد جب تک عورت پاکی نہ حاصل کرلے اسکے ساتھ قربت وہم بستری جائز نہیں۔ البتہ اس "پاک ہونے" میں اختلاف ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ پانی سے غسل مراد ہے، اور جب تک حائضہ عورت خون بند ہونے کے بعد پورا غسل نہ کرلے اس کے ساتھ قربت جائز نہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ صرف نماز کا وضو طہارت کے لیئے کافی ہے، اور بعض کے خیال میں شرمگاہ کے دھو لینے سے طہارت ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس پر اجماع ہے کہ خون بند ہونا ہی قربت کے لیئے کافی نہیں، بلکہ اس کے بعد کسی نہ کسی نوع کی طہارت بھی ضروری ہے، اس لیئے وہی قراءت صحیح ہوگی جس سے طہارت کے باب میں مبالغہ مفہوم ہوتا ہو، کیونکہ خون بند ہو جانے سے بھی ایک قسم کی طہارت حاصل ہو جاتی، اور ان ایام کو جن میں عورت کا خون بند رہتا ہے "طہر" کہتے ہیں۔ پہلی قراءت سے صرف عمومی طہارت سمجھ میں آتی ہے، اور اس صورت میں اشتباہ ہو سکتا ہے کہ "یطہرن" سے مراد صرف خون بند ہونا ہے یا اس سے بھی آگے کچھ اور مطلوب ہے۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "آپ سے آپ کے صحابہ حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، اس لیئے تم ایام حیض

میں اپنی بیویوں کو جدا رکھو اور ان سے قربت نہ کرو، یہاں تک کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد وہ غسل کرلیں" پھر تم ان سے قربت کر سکتے ہو۔"

"فَإِذَا تَطَهَّرْنَ" یعنی "پھر جب، غسل کرکے، پانی کے ذریعہ "پاک ہو جائیں"، "تو ان سے قربت کرو، یہ اس وقت قربت وہم بستری کا حکم نہیں ہے، بلکہ مفہوم صرف اتنا ہے کہ حالتِ حیض میں عورتوں کے ساتھ ہم بستری جو ممنوع تھی وہ اب مباح و جائز ہے۔ اس کی نظائر خود قرآن مجید میں متعدد ہیں، مثلاً "جب احرام سے حلال ہو جاؤ تو شکار کھیلو"، یا "جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ"۔ ان آیات میں گو امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے لیکن فرضیت و وجوب نہیں، بلکہ صرف اباحت مقصود ہے۔

"إِذَا تَطَهَّرْنَ" کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ "پھر جب وہ غسل کرلیں"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، عکرمہ، سفیان، عثمان بن الاسود، حسن اور ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ قول منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "جب وہ نماز کے لئے پاک ہو جائیں"۔ طاؤس و مجاہد سے اس کی روایت ہے۔ راجح تفسیر پہلی ہے، یعنی آیت میں "طہارت" سے مراد غسل لیا جائے۔ کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد صرف وضو کرکے عورت نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اب اگر "تَطَهَّرْنَ" سے مراد صرف نجاست سے پاکی لی جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ خون بند ہونے کے بعد اگر جسم کے ظاہری حصہ پر نجاست نہیں لگی ہے تو عورت سے ہم بستری جائز ہے، اور اس کے لئے کسی مزید طہارت کی ضرورت نہیں، ہاں اگر جسم کے ظاہری حصہ پر نجاست لگی ہوئی ہے تو اس کی صفائی ضروری ہے۔ لیکن یہ استعمال صحیح نہیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ "تَطَهَّرْنَ" سے مراد "نماز کی طہارت مراد لی جائے، یعنی پانی سے پاکی حاصل کئے بغیر، اس سے ہم بستری جائز نہیں۔ اور اسی حد تک سب کا اتفاق ہے کہ اگر ظاہری نجاست نہ بھی ہو۔ پھر بھی اگر پانی کے استعمال پر عورت کو قدرت ہے تو مرد کی اس کے ساتھ ہم بستری ایسی طہارت کے بغیر جائز نہیں جس سے نماز پڑھی جا سکتی ہو۔ یہ اتفاق سب سے اہم دلیل بن گیا ہے اس کی کہ زیرِ تفسیر آیت میں "طہارت" سے مراد غسل ہی ہے، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد عورت کے لیے غسل کے بغیر نماز پڑھنا جائز نہیں۔

"فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ" بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب تمہاری بیویاں پاک ہو جائیں تو تم ان کے پاس اس طریقے سے آؤ.... جس طرح آنے کی حالتِ حیض میں تمھیں ممانعت کی گئی تھی مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی آگے کی شرمگاہ کی طرف سے آؤ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا تھا کہ حالتِ حیض میں ان کے ساتھ ہم بستری نہ کرو، ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، مجاہد، عثمان بن اسود، قتادہ، ربیع اور ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ پھر تم ان کے پاس اس طرح آؤ جس طرح آنے کا اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا ہے، ظاہر ہے کہ حیض کے سوا باقی ایام میں اللہ تعالیٰ نے عورت کے ساتھ ہم بستری کی اجازت دی ہے، اس لئے مطلب ہوگا کہ حیض کے دنوں میں تو عورت کی قربت سے بچتے رہو، لیکن اس کے بعد طہر کے دنوں میں عورتوں کے پاس آؤ۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، ابورزین، عکرمہ، قتادہ، سُدّی اور ضحاک رحمہم اللہ سے اسی طرح تفسیر منقول ہے۔

ابن الحنفیہ نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ "حلال طریقہ سے یعنی نکاح کے بعد عورتوں کے پاس آؤ، ناجائز طریقہ سے نہ آؤ" راجح دوسرا قول ہے، یعنی آیت میں کہا گیا ہے کہ "زمانہ طہر میں عورتوں کے پاس آؤ"۔ جہاں کسی بات کا حکم، امر ہو اسے نہی کے معنیٰ میں مراد لینا صحیح نہیں ہوگا، دونوں ایک دوسرے کی ضد و نقیض ہیں۔ اگرچہ حکم کو بھی توڑ مروڑ کر نہی کے معنیٰ میں مراد لینا ممکن ہے، لیکن بہرحال یہ طریقہ صحیح نہیں۔ پہلے اور دوسرے قول کا اصل مقصد ایک ہی ہے لیکن پہلے قول میں امر کو بلاوجہ نہی کے معنیٰ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے علاوہ پہلے مفہوم کی صورت میں دوسرے مفاسد بھی ہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ" بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں، یعنی جو لوگ اللہ کی نافرمانی کے بجائے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی کی فرمانبرداری و اطاعت کرتے ہیں، اللہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ "تَوبَة" کا مفہوم ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ "وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ" کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ "اور اللہ تعالیٰ پانی سے پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں"۔ یہ تفسیر عطاء سے نقل ہے۔ مجاہدؒ نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں سے توبہ کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں اور ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو عورتوں کے پاس ان کے پیچھے سے آنے سے پاک ہیں"۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ پیچھے سے ہم بستری کرے وہ "مُتَطَھِّرِیْنَ" میں سے نہیں ہے۔ آپ ہی سے آیت کا ایک یہ مفہوم بھی نقل ہے کہ "اللہ تعالیٰ گناہوں سے پاک رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں"، یعنی وہ لوگ جو توبہ کر لینے کے بعد پھر گناہ کا اعادہ نہیں کرتے، پہلا قول، یعنی "اللہ تعالیٰ توبہ، رجوع و انابت کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں اور پانی سے پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں، یعنی ایسی پاکی جس سے حیض بند ہونے کے بعد عورت نماز کے قابل ہو جائے"۔ سیاق و سباق سے یہی مفہوم اغلب معلوم ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے حائضہ عورتوں کے ساتھ اس معاملہ سے منع کیا جو جاہلیت کے زمانہ میں عرب کیا کرتے تھے، یعنی زمانہ حیض میں عورتوں کے ساتھ طعام و شراب تک چھوڑ دینا اور انھیں بالکل الگ تھلگ کر دینا صحیح نہیں۔ اس کے بعد حالتِ حیض میں ان کے ساتھ میل ملاپ کے حدود بتائے اور فرمایا کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد جب تک عورت غسل نہ کر لے اس کے ساتھ ہم بستری جائز نہیں۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کا مفہوم صاف اور واضح ہے کہ پاکی سے یہاں مراد جنابت، حدث اور حیض و نفاس سے پاکی مراد ہے ؛

(معرفت جناب منشی رفیق احمد صاحب۔ محمد المطابع برقی پریس دہلی نمبر ۶)